کچھ سرائیکی افسانے

فیس بک گروپ: عالمی ادب کے اردو تراجم
www.facebook.com/groups/AAKUT/

فہرست

نمبر شمار	افسانے	مصنف	مترجم	صفحہ نمبر
1	بارود کی خوشبو	ڈاکٹر غزالہ احمدانی	سلیم شہزاد	3
2	پیاس	مسرت کلانچوی	حمزہ حسن شیخ	5
3	خدا	غلام حسن حیدرانی	سلیم شہزاد	9
4	باپ یا بھائی	غلام حسن حیدرانی	سلیم شہزاد	15
5	تکمیل	ڈاکٹر گُل عباس اعوان	ڈاکٹر گُل عباس اعوان	21
6	بند کھڑکی	مسرت کلانچوی	سلیم شہزاد	25
7	صدی کا سفر	ڈاکٹر غزالہ احمدانی	سلیم شہزاد	29
8	جٹی چڑیا	حبیب موہانہ	خورشید ربانی	31
9	سفر تھل ماروکا	مسرت کلانچوی	زاہد حسن	37
10	پانی نہیں پیوں گا	مسرت کلانچوی	سلیم سہیل	41

غزالہ احمدانی
سرائیکی سے ترجمہ: سلیم شہزاد

بارود کی خوشبو

قدیم درس گاہ اور جدید ہسپتال کے وسطی چوراہے کے فوارے کی چوٹی پر دو سفید کبوتر بیٹھے ہیں۔ اچانک گولیوں کے چلنے کی آواز آئی اور بارود کی خوشبو پھیل گئی ہے۔ ایک کبوتر زخمی ہو کر گر پڑا۔ دوسرا زخمی کبوتر اڑ گیا۔

دور کہیں دو الّو کسی شاخ پر بیٹھے محو کلام ہیں۔ یہ ہمارے تمھارے معاشرے کے روایتی منحوس الّو نہیں۔ یہ دور حاضر کے دانش مند کالے سفید اُلو ہیں۔ سفید تو کبوتر ہوتا ہے مگر وہ کبوتر تو صرف اولمپکس میں اڑانے کے لیے ہوتے ہیں۔ مگر یہ الو کسی قبرستان کا ذکر نہیں کر رہے۔ یہ ایران کے عادل بادشاہ نوشیرواں کا دور نہیں، یہ آج کل کی بات ہے۔ اچھا اچھا۔ آج کے دور میں قبرستان کا ذکر فضول ہے یہاں تو لاشیں شفاخانے کے سرد خانوں میں سڑتی ہیں یا پھر غائب ہو جاتی ہیں۔

ایک اُلّو نے دوسرے سے پوچھا: دوست تمھیں اس دنیا میں سب سے خوبصورت آواز کون سی لگتی ہے؟

دوسرے نے ترت جواب دیا: کلاشنکوف کے منہ سے نکلنے والی آواز۔ میرا جی چاہتا ہے میں اس میوزک پر رقص کروں۔ ایک سیکنڈ میں تیس گولیاں۔ تیس لاشوں پر میرے رقص کے تیس چکر۔

خاموشی کو کبھی محسوس کیا۔۔۔ بامعنی۔۔۔ خوبصورت سناٹا۔۔۔! دیکھو فضا کتنی معطر ہو گئی ہے!

پہلا اُلو بارود کی خوشبو سے مست ہو کر پوچھتا ہے: یہ ہم کہاں بیٹھے ہیں؟ کمبوچیا میں یا لبنان یا پھر فلسطین میں؟

ہاں شاید کسی تعلیمی ادارے میں۔۔۔؟ آج کیا تاریخ ہے؟

دوسرے نے مسکرا کر جواب دیا: کسی مستقبل کے شہید کی تاریخ پیدائش۔۔۔ یا کسی جیالے کی تاریخ شہادت ہو گی!

وہ گولی چلنے کی آواز۔ کئی کمال راہموں، فاضل راہو اور ابو جہاد ہر گولی کے ساتھ مرتے جاتے ہیں۔

بارود کی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی ہے۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ پہلے سفید الو نے دوسرے الو کو آنکھ مارتے ہوئے کہا؛ بس کر یار! ہم نے امن پھیلانا ہے۔۔۔ ہم سپر پاور ہیں۔۔۔! ہم نے امن کا نوبل پرائز لینا ہے۔

مگر یار! کبوتر کو کیسے ختم کریں۔۔۔؟ اسے ہر مرتبہ اولمپکس میں اڑا دیتے ہیں مگر وہ پھر لوٹ آتا

www.facebook.com/groups/AAKUT/

ہے۔۔۔پٹرول بم سے لے کر راکٹ لانچر تک سارے جنگی آلات دنیا کے بیشتر کونوں پر چل رہے ہیں۔کئی سہاگ اُجڑ رہے ہیں۔۔۔کئی نئے بیاہ ہو رہے ہیں۔

دونوں الو اڑ کر کسی اور جگہ جا بیٹھے۔یہ شاید زیتون کے درخت کی شاخ ہے۔آج کل الوؤں کا بسیرا شاید یہاں ہے۔

وہ دیکھو۔۔۔دور کہیں جنگ ہو رہی ہے۔۔۔یہ کشمیر ہے یا بوسنیا۔۔۔یہ کوئی میدان جنگ نہیں۔۔۔ اس میں شہید ہونے والے مجاہدین یا عام شہری ہیں یا پھر کسی نہ کسی کالج، یونیورسٹی کے طالب علم۔۔۔ہر صورت میں اُلو کی فتح۔۔۔الو اڑتے جاتے ہیں۔۔۔!منہ میں زیتون کا پتہ اٹھائے۔۔۔اڑتے جاتے ہیں۔۔۔! بوسنیا۔۔۔انگور نو کارلباخ، لبنان، افغانستان اور کشمیر کا چکر لگاتے ہیں۔۔۔ایک پر سکون شہر کی کسی عالی شان عمارت پر آ کر بیٹھے ہیں۔۔۔!!

یہ کلہوڑوں یں تالپور کا شہر ہے۔وہ دیکھو پکا قلعہ ہے! شہر کے مختلف حصوں سے اسلحہ سے لیس گاڑیاں داخل ہوئی ہیں۔دیکھتے ہی دیکھتے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور تمام جنگی آلات چل گئے۔

تمھارے میرے شہر پر۔۔۔یہ خالی شہر تو نہیں اور نہ ہی میدان جنگ ہے۔وہ دیکھو لاشوں کے ڈھیر، کھوپڑیوں کے مینار۔۔۔فٹ پاتھ۔۔۔سڑکیں۔۔۔بازار، دکانیں لاشوں سے بھر گئی ہیں۔۔۔یہ کیا ہے۔۔۔؟ دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔۔۔شہر کی آبادی ویسی ہی۔۔۔مگر یہ سناٹا کہاں سے آ گیا ہے۔۔۔بارود کی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی ہے۔۔۔گہرا سناٹا اور معنی خیز سکوت پھیلتا ہے۔

میرے اندر۔۔۔اندر۔۔۔میری روح میں۔۔۔!! دور کہیں کتے بھونک رہے ہیں، لاشوں کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔کہاں ہیں خدائی فوج دار۔۔۔؟ کہاں ہیں امن کے پیامبر۔۔۔؟ کبھی الو بھی امن پھیلا سکتے ہیں۔۔۔؟ کبھی ان کا وجود بھی امن کی علامت بن سکتا ہے۔۔۔؟ سسکتی انسانیت کے گال پر جبر کا یہ بہتا ہوا آنسو پونچھو۔

وہ دیکھو! اس لاشوں کے شہر میں آج بھی میٹرنٹی ہوم بھرے پڑے ہیں!!

وہ دیکھو لیبر روم سے 'لڑکے' کی پیدائش کی خوش خبری آئی ہے... شاید خدا اپنی کائنات سے مایوس نہیں ہوا۔۔۔مگر باہر تو بارود کی خوشبو ہے۔۔۔کالے الوؤں کا راج ہے۔۔۔ہسپتال کے باہر 'مدر ٹریسا اور عبدالستار ایدھی' منتظر کھڑے ہیں۔۔۔دیکھو ان کو کیا ملتا ہے۔۔۔لاش۔۔۔کہ بچہ۔۔۔؟

چوک فوارے کے قدموں میں ایک کبوتر آخری سانس لے رہا ہے اور دوسرا زخمی ہوا دور اُفق کی وسعتوں میں لڑکھڑاتا اڑتا جاتا ہے..... شاید شاخ زیتون کی تلاش میں....!

مسرت کلانچوی
سرائیکی سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

پیاس

فیضان تھل کا رہنے والا تھا۔ وہ سات دن کے بعد، اپنی بیوی مومل کو واپس اپنے گھر لا رہا تھا۔ انھوں نے اپنا سفر صبح سویرے شروع کیا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ جب تک سورج کی کرنیں اپنی تپش سے ٹھنڈی ریت کو خشک کریں گی تو اس وقت تک وہ گھر پہنچ چکے ہونگے۔

فیضان کو اس سے پہلے کسی عورت کے ساتھ سفر کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ نا آشنا تھا کہ جب ایک عورت پائل پہن کر آہستہ آہستہ اپنے قدم اٹھاتی ہے تو پرندے بھی اس کی جھنکار سن کر اپنے گیت بھول جاتے ہیں۔ وہ عورتیں جو لاٹھی تھامے، سارا دن بھیڑوں کے ریوڑ کے پیچھے بھاگتی تھیں، ان کو بھی آج پتہ چلا تھا کہ کیوں پائل دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جھنکتی ہے۔

مومل کی جلد دن کی سفیدی کی طرح چمکیلی تھی۔ اس نے ناک میں نتھلی پہنی ہوئی تھی۔ سات دن پہلے، اسے اپنے خاوند کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ آج ٹھنڈی ریت پر چلتے ہوئے جب وہ پانی کا ایک نالہ عبور کر رہے تھے، اس نے خود ہی اپنا نرم ہاتھ، فیضان کے ہاتھوں میں تھما دیا تھا۔

ساری زندگی فیضان نے کلہاڑے کے ساتھ لکڑیاں کاٹی تھیں اور اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے ہو چکے تھے، جیسے ہی مومل کے ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو چھوا، اس کو یوں محسوس ہوا جیسے پھولوں نے کانٹوں کے سارے زہر کو چوس لیا ہو۔

''نیک بخت! کیا تم کو پیاس لگی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں تو۔۔ مجھے تو نہیں لگی۔''

''تم اتنی شرما کیوں رہی ہو؟ اتنے زیادہ سفر کے بعد، مجھے پیاس لگ رہی ہے تو پھر تمھیں کیوں نہیں؟ آؤ، ان جھاڑیوں کے سائے تلے بیٹھتے ہیں، پانی پیتے ہیں اور کچھ دیر آرام کرتے ہیں۔ کیکر کے درخت کے سائے میں، فیضان نے اپنے اور مومل کے جوتے اتارے۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی نہ سوچا کہ ابھی ایک لمبا سفر باقی ہے جب کہ ان کے پاس بہت کم پانی ہے۔ انھوں نے پیٹ بھر کے پانی پیا۔ ریت پہ، فیضان نے مومل کو ایسے ہی گلے لگا لیا جیسے سامنے والی دونوں شاخیں ایک دوسرے کے گلے مل رہی تھیں۔ سبز پتے اور

کیکر کی پیلی پھلیوں نے خوشی خوشی تالیاں بجائیں۔ ہوا نے محبت بھرے گیت گنگنائے اور مومل فیضان کے بازو پہ سر رکھ کر سو گئی اور فیضان بھی اپنے خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔

لیکن سورج نے ان کے خوابوں کے مقابلے میں بہت تیزی سے سفر کیا اور آدھا دن گزر گیا۔ سورج کی کرنیں جب فیضان اور مومل کی آنکھوں میں پڑیں تو دونوں ہی چونک کر اٹھ بیٹھے۔ دونوں کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ان کے چہرے پسینے سے شرابور تھے اور ان کے لب خشک تھے۔

''دن گزر گیا ہے۔'' مومل کی آواز میں لرزش تھی۔ فیضان کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہ تھا کہ کیوں اور کتنا دن گزر گیا ہے؟ مومل بھی کچھ دیر کے لیے خاموش رہی، پھر اپنے جوتے پہنتے ہوئی بولی؛

''کیا بہت سفر باقی رہ گیا ہے؟''

''نہیں۔۔۔ زیادہ نہیں۔۔۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو، جب میں تمھارے ساتھ ہوں؟''

فیضان نے اپنے جوتے ایک دوسرے پہ مار کے مٹی جھاڑی۔ وہ جانتا تھا کہ ریت دوبارہ ان سے چمٹ جائے گی۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نہ اس نے ایسے جوتے پہلے کبھی پہنے ہیں اور نہ وہ دوبارہ کبھی پہنے گا۔

مومل نے بھی اپنے دوپٹے سے اپنا پسینہ صاف کر لیا تھا اور فیضان جمائیاں لیتا ہوا اس کو گھورنے لگا۔ اس کے لب بھی خشک ہو چکے تھے۔ اس نے سامان میں سے پانی کی بوتل نکالی۔ اس نے مومل کو پانی کے کچھ گھونٹ پلائے اور کچھ خود بھی پیے۔ دونوں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

گرم ہوا نے ریت کے گرم ذرات اڑا کر ان کے منہ بھر دیئے تب مومل نے اپنے گاؤں کو یاد کیا جہاں آج کل گنے کی فصل اپنی بہار پر تھی۔ جس کے درمیان چھوٹے چھوٹے نالے سانپوں کی طرح پیچ و خم کھاتے ہوئے گزرتے تھے جو کبھی کبھار فصل میں چھپ جاتے اور کبھی کبھار باہر نکل آتے۔ یہ نالے ان کنووں سے بہتے تھے جہاں مومل اور شیداں کھیلتے ہوئے بڑی ہوئی تھیں۔ سبز اور پیلی فصل دوستوں کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ لے کر کھیلتی اور جھومتی رہتی۔ نالے کے اردگرد، درختوں پر بیٹھے پرندے گیت گاتے اور مومل وہاں پر اپنی بھیڑیں چراتی۔

بانسری کی لے ہر سُو گونجتی لیکن مومل نے کبھی اس پہ کان بھی نہ دھرے تھے۔ اس نے اپنے بچپن میں یہ سنا تھا کہ اس کا منگیتر اس سے شادی کرنے کے لیے روہی سے آئے گا۔ جب اس نے فیضان کو دیکھا تو وہ اس کے خوابوں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔

فیضان بھی نا آشنا تھا کہ، مومل جس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی تھی اور جو ایک ٹافی کے لیے رونا

www.facebook.com/groups/AAKUT/

شروع کر دیتی تھی۔ وہ اب جوان ہو چکی تھی اور اب وہ اصلی والی مومل بن چکی تھی۔ اس کی منگیتر ایک نوجوان عورت ہوگی اور اس کا قد اس کے کندھوں کے برابر ہوگا۔ یہ گرم ہوا اور بنجر زمین کے باشندوں کے لیے ایک خوبصورت خواب تھا کہ سرسبز اور بارش والے گاؤں کی ایک لڑکی اس کی بیوی بننے جا رہی تھی۔ اس نے مومل کو دیکھا جس کا رنگ کپاس کی طرح سفید تھا، اس کی آنکھیں کسی تازہ لبالب بھرے ہوئے تالاب کی طرح تھیں اور اس کا نازک جسم سریم کے درخت کی طرح تھا۔ وہ اپنے گاؤں کی طرح خوبصورت تھی۔

فیضان نے دوبارہ مومل کی جانب دیکھا جو تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ سورج کی چلچلاتی کرنوں نے اس کی بڑی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا فراک تھام رکھا تھا جب کہ دوسرے ہاتھ، اس نے اپنے ماتھے پر رکھا ہوا تھا لیکن پھر بھی جھلستی کرنیں اس کی پلکوں کو جلا رہیں تھیں۔

''میں جانتا ہوں مومل۔ روہی کا یہ سفر تمھارے لیے نیا اور مشکل ہے۔ لیکن جب ہم گھر پہنچیں گے تو میں تمھیں ہمیشہ آرام دوں گا۔''

فیضان نے خواہش کی کہ کاش وہ شیشم کا گھنا سایہ ہوتا۔ وہ مومل کے لیے ٹھنڈی ہوا اور سایہ لے آتا یا وہ آسمان پر بادل کی طرح پھیل جاتا۔ وہ زوردار بارش کر کے مومل کو بھگو دیتا۔

لیکن سورج نے ریت کے ٹیلوں کے ساتھ مشورہ کیا اور دوبارہ طوفانی آندھی شروع ہوگئی۔ یہ اتنی تیز تھی کہ دونوں کے قدم اکھڑ گئے۔ آندھی اپنی آگ برسانے کے بعد ختم ہوگئی اور ان کے گلوں میں صرف کنکر اور کانٹے رہ گئے۔

دونوں ہی بے بس ہو کر نیچے گر گئے تھے۔ فیضان اٹھا اور مومل کی مدد کے لیے دوڑا۔ وہ مرجھائے ہوئے گلاب کے پھول کی طرح بے ہوش ہو چکی تھی۔ پیاس کی شدت سے، اس کے لب روہی کی زمین کی طرح خشک ہو چکے تھے جہاں کبھی کبھار پانی کھڑا رہتا اور بعد میں وہ بھی قحط کی وجہ سے ختم ہو جاتا۔ اس کی پلکیں اتنی سیدھی تھیں جیسے وہ پلکیں نہیں بلکہ کانٹے ہوں۔ فیضان خود بھی ہانپ رہا تھا۔

''کیا ہمیں صرف دو دن ہی اکٹھے رہنا تھا؟'' یہ سوچ کر فیضان کانپ اٹھا۔ اس نے بے بسی کے ساتھ آسمان کی جانب دیکھا۔ اس کو ایک اونٹ اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی پگڑی سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور دوبارہ دیکھا۔ اب اونٹ پر سوار نوجوان آدمی بھی نظر آ رہا تھا۔

''مومل۔۔۔ مومل۔۔۔ اٹھو۔ دیکھو کوئی فرشتہ ہمارے لیے پانی لے کر آ رہا ہے۔ ہم نہیں مر سکتے۔ ہمیں ابھی زندہ۔۔۔ یقیناً۔۔۔ ایک دوسرے کے لیے۔۔۔''

فیضان خوشی کے مارے پُر جوش ہو گیا۔ مومل نے بھی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اونٹ سوار اس کی

www.facebook.com/groups/AAKUT/

جانب آ رہا تھا۔ فیضان نے اپنی پگڑی ہوا میں لہرا کر اپنی جانب اس کو متوجہ کیا۔ اونٹ ان کی جانب دوڑتا چلا آیا۔ وہ بڑی سرخ آنکھوں والا ایک خوفناک آدمی تھا۔

''جناب۔۔۔ ہمیشہ جیئں۔۔۔ آپ کے پاس پانی ہوگا۔۔۔ صرف چند گھونٹ۔۔۔''

''ہاں۔۔۔'' اس نوجوان نے چبھتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ جواب دیا۔ ''میرے پاس تمھاری پیاس کے لیے پانی ہے لیکن میں بھی تو پیاسا ہوں۔۔۔'' فیضان کے لبوں پہ پیاس کی خاموشی تھی۔ آدمی نے اپنا ہاتھ نیچے کی جانب بڑھایا اور مومل کو اس کے بازو سے پکڑ کر زبردستی اوپر کی جانب کھینچ لیا۔

اونٹ دوڑا، فیضان نے بھی اس کا پیچھا کیا لیکن اس آدمی نے دور سے پانی کی بوتل اس کی جانب اچھال دی۔ فیضان پانی کی جانب دوڑا۔ پانی قطرہ قطرہ اس کی پیاس بجھا رہا تھا جب کہ مومل لمحہ بہ لمحہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

غلام حسن حیدرانی
سرائیکی سے ترجمہ: سلیم شہزاد

خُدا

صغریٰ کی آنکھ کافی دیر سے سامنے والی دیوار پر ٹکی ہوئی تھی۔ وہ بُجھی ہوئی ایک ہی جگہ پر بیٹھی تھی۔ پورا کمرہ عورتوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے دکھ میں دوبارہ شرکت کے لیے تمام بستی کی عورتیں آ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کیوں کہ آج صغریٰ کے خاوند اکرم کے قل تھے۔ صغریٰ کا نزدیکی عزیز تو کوئی نہیں تھا مگر یہ جو پہاڑ ٹوٹا تھا اس کا دکھ سب کو تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی چار سال سے شادی شدہ دوشیزہ کو بیوگی کا دکھ دے کر اکرم جوانی ہی میں قبر میں جا سویا۔ چھوٹی سی عمر میں بیوگی اس کے دامن سے چمٹ گئی تھی۔ سال ڈیڑھ سال کا سعید ابھی اچھی طرح چلنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ اکرم گزر گیا۔ صغریٰ اور سعید نے اس دنیا کا سکھ دیکھا ہی تھا کہ غم کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا۔ اللہ بے نیاز جو ہوا۔

آج صغریٰ کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں تھا۔ شاید ان تین دنوں میں اتنا رو چکی تھی کہ سارے دریا خشک ہو گئے تھے۔ وہ دیوار پر آنکھیں ٹکائے سوچ رہی تھی کہ یہ پہاڑ جتنی زندگی کیسے گزرے گی؟ یہ معصوم بچہ کیسے پلے گا؟ اس نے تو باپ کو جی بھر کر دیکھا بھی نہیں، نہ باپ نے اس کو دل بھر کر پیار کیا، نہ گود کھلایا۔ باپ بیٹا ایک دوسرے کو ترستے اللہ میاں کی تقدیر مان کر بچھڑ گئے۔ ایک ایک کر کے بستی کی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ اب صغریٰ اپنے ویران اور اداسی بھرے کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ سعید گرتا پڑتا ماں کی گود میں آ گیا۔ میٹھی توتلی زبان سے بولا: ''اماں..... بابا تہاں ہے؟''

صغریٰ کا دل حلق میں آ گیا۔ سینے پر چھریاں چل گئیں۔ دل میں سوچا اور پھر چیخیں نکل گئیں۔ میرے چاند جیسے جگر پر یتیمی کی دھوپ آن پڑی ہے۔ اس کا منہ کُملا گیا ہے۔ وہ سعید کو پیار کرتے ہوئے کافی دیر تک چومتی رہی اور کہنے لگی۔ ''تمہارا بابا اللہ میاں کے پاس گیا۔'' یہ سن کر سعید خوشی سے ماں کی گود میں ناچنے لگا۔ نادان کو کیا پتہ تھا کہ اصل بات کیا ہے؟ سب نے مر جانا ہے، باقی تو اللہ کا نام ہی رہ جائے گا مگر اکرم کے مرنے سے جو بھار صغریٰ کے کمزور کندھوں پر آ پڑا تھا اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ نہ یہ کاغذ کے ورق اس بھار کے بوجھ کو اٹھا سکتے ہیں۔ اللہ میاں کسی پر ایسا بوجھ نہ ڈالے۔

آج صغریٰ کے سر پر خزاں رسیدہ جوانی اور معصوم امانت کا بار آ پڑا۔ سچ ہے جس کا کوئی نہ ہو اس کا

www.facebook.com/groups/AAKUT/

خدا خود مددگار ہوتا ہے۔ اس طرح صغری کو بھی اللہ نے ہمت دی۔ اٹھ کر گھر کو سنبھالا، اکرم کا چھوڑا ہوا ترکہ ڈھونڈا۔ دو چار روپے کی بھان ... چار پانچ سیر آٹا... سیر آدھ سیر دال... چاندی کے کنگن اور ہسی چار پانچ کپڑے، جواب بستی کی عورتیں بیوگی پر دے گئیں تھیں۔ ہر چیز کو دیکھ بھال کے، دل پر پتھر رکھ کر، دو روٹیاں پکائیں، کھائیں اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

دعا مانگی اللہ کرے سب اپنے جنے ہوؤں کی خود ہی پال سنبھال کریں۔ صغری ماں کے ساتھ ساتھ سعید کا باپ بھی بن گئی، سعید کو اللہ کے بھروسے پر پالنے لگ پڑی۔ ایک اللہ کا بھروسہ دوسرا اللہ کے بنائے ہوئے ہاتھوں کے آسرے پر لوگوں کے کپڑے سینے پرونے لگی۔ پرائے گھروں میں جا جا کر ان کے کپڑے دھوتی، برتن مانجھتی، فصل کے موقع پر کٹائی کرتی، مزدوری کرنے لگی۔ اس طرح اپنا اور سعید کا پیٹ پالنے لگی۔

بستی کی عورتوں نے کئی مرتبہ کہا، کل کی لڑکی ہو، کب تک محنت کر کے کھاؤ گی؟ نکاح کر لو، مگر صغری نے ٹھان لی تھی کہ اپنے لیے تو ہر کوئی جیتا ہے کسی اور کے لیے بھی تو کوئی جی کر دکھائے۔ اب جتنی زندگی ہے سعید کے لیے جیوں گی۔ اس لیے صغری نے نہ شادی کی اور نہ ہی کسی جگہ پر پکی نوکری۔ صرف مزدوری کرتی رہی تا کہ سعید اس سے جدا ہو کر مایوس نہ ہو جائے۔ وہ اکرم کی نشانی اور امانت کو دل سے لگائے اکٹھے گزارے۔ چار سال کے زمانے کو یاد کر کر کے وفا کی لاج پالتی رہی۔

بھلا وقت تھا کہ گزرتا رہا۔ سعید خیر سے اب چھ سات کا ہو گیا تو اس کی ماں نے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ سعید بھی لوگوں کے بچوں کے ساتھ پڑھنے لگا۔ صغری اکرم کی روح کو خوش کرنے میں یوں مست ہوئی کہ اس کے ذہن سے یہ بات بھی اتر گئی کہ وہ مرد ہے یا عورت، بوڑھی ہے یا جوان۔ اسے ایک ہی خبط تھا کہ کسی طرح اکرم کی امانت پل جائے تو قیامت کے دن وہ اس کے سامنے سرخرو ہو کر اٹھے۔

اب آپ اندازہ لگائیں جو عورت اس دل و دماغ کی مالک ہو اس نے بیٹے کو کیسی عقل دی ہوگی۔ سعید بہت شریف اور بھلا مانس نکلا۔ اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ رہ رہے ہیں۔ کچھ لڑکے سعید کو طعنے دیتے کہ سعید کی ماں مزدوری کر کے کھاتی ہے۔ مگر کچھ سعید کے ساتھ مکمل ہمدردی اور محبت بھی رکھتے، ہمت بھی بندھواتے، تگڑے بنو... مایوس نہ ہو... یہ دن سدا نہیں رہنے۔ لڑکوں کے طعنوں سے زچ ہو کر ایک مرتبہ سعید نے ماں کو کہا بھی کہ اماں تم مزدوری نہ کیا کرو۔ مجھے سکول کے لڑکے طعنے دیتے ہیں۔ ناسمجھ بچے نے نہ سوچا نہ سمجھا کہ ماں مزدوری نہ کرے گی تو کھائیں گے کہاں سے؟ ماں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ سعید بیٹا اگر تمھیں طعنے برے لگتے ہیں تو اس کا علاج یہ نہیں کہ میں مزدوری چھوڑ دوں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تم بہت زیادہ پڑھ کر کوئی بڑی نوکری کر لو پھر ہم لوگوں میں عزت کے ساتھ رہ سکیں گے۔ کوئی تمھیں طعنہ نہ دے گا۔ سعید کو ماں کی

یہ بات بہت بھلی لگی۔اس نے اس طرح ذوق شوق سے محنت کی کہ پانچویں اور آٹھویں میں وظیفہ لیا۔بستی کے کئی لڑکے قصبے کے ہائی سکول میں پڑھنے لگے۔سعید بھی ان کے ساتھ پڑھنے لگا۔سعید ماں کی بات نہ بھولا۔ وہ محنتی اور بھلا مانس بچہ تھا۔سارے استاد اس کی عزت کرتے تھے۔ہم جماعت بھی اسے اچھی نظروں سے دیکھتے تھے۔عقل کے ساتھ ساتھ محنت رنگ لائی تو سعید نے پھر دسویں میں وظیفہ حاصل کیا۔صغری نے اسے کہا کہ اب تم ملتان کے بڑے کالج میں پڑھنے چلے جاؤ۔سعید نے جواب دیا: نہ اماں کالج میں امیروں کے بچے پڑھتے ہیں کیوں کہ وہاں فیسیں زیادہ ہوتی ہیں۔خرچے کی وجہ سے میں بھی پریشان ہوں گا اور تم بھی۔کالج کی تعلیم اور غریب کا بچہ۔واہ دکھ کے ساتھ سکھ ہے۔تم فکر نہ کرو۔دل چھوٹا مت کرو۔

نہیں اماں میں اب بڑا ہوں۔کمانے لائق ہو گیا ہوں۔کلرکی تو مل ہی جائے گی۔کب تک میں تمھاری ہڈیاں توڑ توڑ کر کھاتا اور پڑھتا رہوں گا؟ میں تمھاری کوئی بات نہیں سنتی۔تم یہ بتاؤ ابتدائی طور پر کتنی فیس لیں گے ؟سعید نے بتایا تو صغری نے ہسّی کنگن بیچ کر سعید کو پیسے دیے اور روانہ ہونے سے پہلے کہنے لگی۔بیٹا تم فکر نہ کرو میں ہر ماہ تمھیں خرچہ بھیجتی رہوں گی،تم محنت کر کے پڑھتے رہو،میری خواہش ہے کہ تم بہت زیادہ پڑھ لو۔

سعید خاموشی سے ملتان چلا آیا۔کالج میں داخل ہو گیا۔پہلے تو وہ ہوسٹل میں رہتا تھا مگر وہاں مزہ نہ آیا کیوں کہ وہاں پڑھائی نہیں ہوتی تھی،کالج کے لڑکے شرارتیں کرتے تھے۔بہت غصہ آیا۔سڑک کے ساتھ ایک کمرہ پانچ روپے کرایہ پر مل گیا۔کمرہ تھا تو چھوٹا مگر سکون تو تھا۔بازار گیا،ایک چارپائی اور کباڑیئے سے میز کرسی بھی لے آیا۔ایک طرف چارپائی تو دوسری طرف میز کرسی لگا دی۔ایک دن خیال آیا بوڑھی ماں سارا سارا دن محنت مزدوری کرتی رہتی ہے۔میں جوان جہان ہو کر بھی چنڈوکوں کا کام بھی نہیں کرتا۔کچھ سوچ کر بازار گیا ۔دو برش،دو پالش کی کالی اور لال ڈبیاں لے آیا۔کالج سے آتا،کپڑے تبدیل کر کے اسٹیشن پر چلا جاتا۔اس طرح روپیہ دو روپے کما لیتا۔پھر رات کو دیر تک پڑھتا رہتا۔اس طرح بہت اچھا وقت گزرتا رہا۔کبھی کبھی چھٹی لے کر ماں کو بھی مل آتا۔ماں کی ایک ہی بات،سعید بیٹا محنت کرو،محنت کر کے پڑھتے رہو۔

سعید اب بارہویں میں پڑھتا تھا۔اس کا یہ وطیرہ بن گیا تھا کہ صبح کالج جاتا وہاں سے واپسی آ کر بوٹ پالش کرنے اسٹیشن چلا جاتا۔پھر مٹی کے تیل کے دیے پر آدھی رات تک پڑھتا رہتا۔شدید سردی کے دن تھے۔ایک دن بارش برسنے لگی۔بادل برستے رہے،خار گرتے رہے۔تمام دن سورج نہ نکلا۔سعید کالج سے واپس آ کر رضائی اوڑھ کر سو گیا۔آج بوٹ پالش کرنے بھی نہ جا سکا۔شام کو اٹھ کر دائی سے دو روٹیاں خریدیں ۔آنے کی دال کے ساتھ کھا کر کمرے میں آ کر پڑھنے بیٹھ گیا۔جیسے جیسے وقت گزرتا گیا،بارش بڑھتی گئی۔کوئی دس بجے کا وقت ہو گا کہ دروازہ بجا۔سعید نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔سامنے ایک سولہ سترہ سال کی نوجوان لڑکی

www.facebook.com/groups/AAKUT/

جس کے قیمتی ریشمی کپڑے بارش سے بھیگ کر اس کے تن سے چمٹے ہوئے تھے۔اس کا جسم ننگے ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔سردی سے کھڑی کانپ رہی تھی۔سعید اس کی آنکھوں میں ڈر اور خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر بولا۔

''اندر آجائیں۔''

وہ ڈرتی کانپتی اندر آ گئی۔سعید نے اپنا پرانے ٹین کا ٹرنک کھولا۔ایک شلوار قمیض نکالی۔شلوار میں آزار بند ڈال کر کپڑے اسے تھماتے ہوئے کہا۔''میں باہر کھڑا ہو جاتا ہوں،تم کپڑے بدل لو۔''

سعید باہر نکل آیا۔نوجوان لڑکی نے کپڑے بدلے۔آہستہ آہستہ کنگھی کی۔سعید نے پوچھا۔''اندر آ جاؤں؟''

بڑی مشکل سے اس نے کہا۔''ہاں''

سعید نے اندر آ کر کپڑے نچوڑ کر دیوار کے ساتھ لٹکا دیے کہ صبح تک سوکھ جائیں۔یہ کام نمٹا کر سعید نے لڑکی سے کہا۔''میرے نوماہی امتحان ہونے والے ہیں،ویسے بھی دیر تک پڑھتا ہوں۔دوسرا یہ کہ آج کالج کے بعد میں نے کافی سو لیا ہے۔تمھیں کافی ٹھنڈ لگ رہی ہے تم بستر پر سو جاؤ۔میں آج تمام رات پڑھتا رہوں گا۔''

وہ لڑکی لیٹ تو گئی مگر دل کے خدشے،ڈر،پریشانی نے آنکھ نہ لگنے دی۔نیند نہ آئی۔وہ رضائی میں سے منہ نکال کر شکستہ کرسی پر بیٹھ کر سردی میں پڑھتے ہوئے اس خوبصورت نوجوان کو دیکھتی رہی۔

ایک دو بجے کا وقت ہوگا،سعید کے اندر نفس اور ضمیر کی جنگ چھڑ گئی۔سعید بے قراری سے پہلو بدلتا رہا۔اس کے ہلنے سے بڑی اور ٹوٹی پھوٹی کرسی چیختی تو اس لڑکی کی جان نکل جاتی۔سعید نے ایک مرتبہ چارپائی کی جانب دیکھا۔وہ لڑکی رضائی سے منہ نکالے سعید کی حالت دیکھ دیکھ کر پہلے ہی دہشت زدہ تھی۔اب جو اس کی لال لال آنکھیں دیکھیں تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔سعید نے اسے دیکھ کر پھر دیے کو دیکھا۔پھر بائیں ہاتھ کی انگلی دیے کی لَو پر رکھ دی۔جب چمڑی تڑتڑ کرنے لگی تو انگلی ہٹا لی۔سر کو جھٹکا دے کر پڑھنے بیٹھ گیا۔گھنٹہ دو گھنٹہ گزرے ہوں گے کہ پھر سعید کی حالت خراب ہو گئی اس نے دوسری انگلی دیے پر رکھ دی۔زیادہ جلی تو جُھرجُھری لے کر اٹھا لی۔پھر پڑھنے لگا۔سعید کی حالت ایسے بنتی بگڑتی رہی اور وہ اپنی انگلیاں جلاتا رہا۔وہ لڑکی مجبور ہو کر ایک مجبور کا تماشہ دیکھتی رہی۔اب خوف کی جگہ اس لڑکی کے اندر ہمدردی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔وہ مجبور کی مجبوری کا تماشہ مجبور ہو کر دیکھتی تو رہی مگر کچھ کہنے سے مجبور ہی رہی۔

سچ ہے وقت کسی کی پروا نہیں کرتا۔یہ قیامت اور طوفان بھری لمبی رات بھی گزر گئی۔صبح طلوع ہو گئی۔بارش رک گئی۔بادل بکھر گئے،شاید ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔وہ لڑکی رضائی سے نکل آئی۔تو سعید باہر نکل گیا۔

وہ کپڑے بدل کر باہر آئی، سعید کو دیکھا۔ جاگنے کی وجہ سے جس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ، منہ کملایا ہوا اور زرد ہو رہا تھا۔ اس لڑکی کے دل سے چیخیں نکل گئیں۔ ہونٹ ہلے مگر الفاظ گلے میں پھنس گئے۔ صرف دو آنسو ٹپک کر گرے اور وہ آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد سعید نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے یوں لگا کہ ساری رات مُنوں بوجھ تلے دبا پڑا رہا ہو۔ وہ گئی تو جیسے سارا بوجھ اتر گیا۔ اب عقل ٹھکانے آئی اور ہاتھ کے درد نے بے تاب کیا۔ پرانی چادر پھاڑ کر پٹیاں باندھیں۔ اس وقت سعید کو ماں یاد آئی۔ خیالوں میں سعید ماں سے باتیں کرنے لگا۔

''ماں... میری اچھی ماں... آج آ کر دیکھو... تمہارا بیٹا کتنا محنتی ہے... بھلے ہاتھ کی ساری انگلیاں کوئلہ ہو گئی ہیں... اس امتحان میں نمبر تو... سو کے سو لیے ہیں۔''

خوشی کے مارے سعید کے آنسو بہنے لگے۔ ہاتھ میں جلن بہت بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر سعید کو بخار ہو گیا۔ رضائی اوڑھ کر سو گیا۔ آج کالج بھی نہ جا سکا۔

وہ لڑکی ایک امیر کبیر شخص میاں دلاور کی بیٹی نسرین تھی۔ گھر والے تمام رات سو نہ سکے۔ ہر طرف فون کھڑکایا۔ کاریں بھگائیں مگر نسرین کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔ صبح نسرین گھر پہنچی وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ نسرین کو ماں نے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''میری تو جان نکل گئی، تم کہاں رہ گئی تھی؟''

نسرین نے جواب دیا۔ ''اماں میں رات خدا کے پاس رہ گئی تھی۔''

یہ بات سن کر سارے گھر والے پریشان ہو گئے۔ یہ فکر کہ نسرین کا دماغ تو ٹھیک ہے؟ نسرین دوبارہ بولی۔ ''سچ اماں! رات خدا کے ساتھ گزاری ہے۔ وہ تمام رات سردی میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ میں رضائی اوڑھ کر سوئی رہی۔''

نسرین کی ماں رونے پیٹنے لگی۔ ''ہائے ہائے میری بیٹی پاگل ہو گئی ہے۔ خدا کے لیے ڈاکٹر کو بلاؤ!''

میاں دلاور نے بڑے حوصلے سے پوچھا۔ ''نسرین بیٹی تم کیا کہہ رہی ہو؟''

نسرین بولی۔ ''بابا ٹھیک تو کہہ رہی ہوں۔ قرآن پاک میں نہیں آیا، اللہ میاں نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ انھیں آدمیت اور انسانیت کا شرف بخشا۔ بے شک فرشتے شور مچاتے رہے۔ اللہ میاں نے آدم علیہ السلام کو زمین کی خلافت بھی دے ڈالی۔ اسی طرح بے شک اس کی انگلیاں جل کر کوئلہ ہو گئیں۔ اس نے انسانیت کو شرف بخشا۔ آدمیت کی عزت کی۔ خود ساری رات سردی میں ٹھٹھرتا رہا مگر مجھے گرم گرم بستر دے دیا۔ اسی خدا کے پاس تو رہ گئی تھی۔''

میاں دلاور کے پلے کچھ نہ کچھ بات پڑی۔ وہ نسرین کو اندر لے آیا۔ تمام لوگ صوفوں پر بیٹھ گئے۔

دلاور خان بولا۔ ''بیٹی اب تم تمام باتیں تسلی سے بتاؤ۔''

''بابا کل جس وقت کالج سے چھٹی ہوئی مجھے نرگس اور رابعہ نے کہا ہمارے گھر چائے پی کر چلی جانا۔ میں کہتی رہی میری کار آئے گی اس پر چلے جائیں گے مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ ہم تانگے پر بیٹھ کر چلی گئیں۔ چائے پی کر سب کا فلم دیکھنے کو جی چاہا۔ پھر ہم فلم دیکھنے چلے گئے۔ ایک تو فلم بے ہودہ تھی۔ دوسرا نرگس اور رابعہ کا گنداذاق۔ مجھے جو غصہ آیا اٹھ کر چل پڑی۔ غصے میں کوئی بات نہ سوجھی۔ ہوش آیا تو بارش سے تمام کپڑے بھیگ گئے تھے۔ ایک تو راستے کا پتہ نہ تھا اوپر سے بجلی چلی گئی۔ پھر تو بہت ہول اٹھا۔ ایک دروازے سے روشنی کی جھلک دیکھی۔ سردی لگی ہوئی تھی۔ مجبور ہو کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک نوجوان شاید بارہویں میں پڑھتا ہے نے دروازہ کھولا۔ مجھے اندر لے گیا۔ چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ ایک طرف چارپائی اور دوسری جانب میز کرسی پڑی تھی۔ اس نے مجھے اپنے کپڑے دیے اور باہر چلا گیا۔ میں کپڑے بدل کر رضائی میں پڑ رہی وہ ساری رات سردی میں مٹی کے تیل کے دیے میں پڑھتا بیٹھا رہا۔ اس پر شیطان نے بڑے حملے کیے وہ اپنی انگلیاں دیے پر جلاتا رہا۔ اس طرح اس کی بائیں ہاتھ کی انگلیاں جل کر کوئلہ ہو گئیں۔''

''بابا تم بتاؤ! کیا میں نے جھوٹ کہا ہے؟ آدمی تو وہ ہوتے ہیں جو بھائیوں کے گلے کاٹتے ہیں۔ بہنیں بھی ممتا پر کلہاڑیاں چلاتی ہیں۔ آدمی تو آدمی کا لہو پیتا ہے۔ نقب لگاتا ہے۔ قتل کرتا ہے۔ خون پسینے کی کمائی چھین لیتا ہے۔ دوسرے کی عزت خوار کرتا ہے۔ دودھ میں پانی ملاتا ہے۔ آٹے میں مٹی۔ گھی میں تیل۔ تیل میں ڈیزل۔ مرچوں میں سرخی ملاتا ہے۔ آدمی آدمی کی کمائی پر خود عیش کرتا ہے۔ محلات اسارتا ہے۔ دوسروں کی کمائی سے اپنے کتوں کو دودھ ملائیوں سے موٹا تازہ کرتا ہے۔ ہر کمانے والے سے سوکھی روٹی بھی چھین لیتا ہے۔ آدمی تو بابا یہ ہوتے ہیں۔''

''اس نے تو انسانیت کو شرف بخشا ہے۔ آدمیت کی عزت کی ہے۔ وہ آدمی نہیں ہو سکتا بابا! وہ خدا ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہ خدا تھا۔''

میاں دلاور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں میری بیٹی، تم سچی ہو۔ تم سچ کہتی ہو۔''

☆☆☆☆

غلام حسن حیدرانی
سرائیکی سے ترجمہ: سلیم شہزاد

باپ یا بھائی

جندن آٹھ نو برس کی ہوگی جب قادرا اللہ کو پیارا ہوا۔ قادرے نے تو اس دنیا کے دکھوں سے جان چھڑا کر قبر کو گلے لگا لیا۔ مگر صابو کے سر پر بیوگی کا جو پہاڑ ٹوٹا وہ صرف وہی جانتی تھی۔ اس کی شادی کو سترہ برس بیت گئے لیکن وہ اولاد سے محروم رہی۔ جب اللہ نے اپنا کرم فرمایا تو جندن پیدا ہوئی۔ وہ ابھی آٹھ نو برس کی ہی ہوئی تھی کہ باپ اس دنیا سے سدھار گیا۔ دونوں ماں بیٹی ساون کی طرح روئیں۔ ان کے بین سن کر دل دہل جاتا تھا۔ مگر خدا کی کرنی پر آخر صبر آ ہی جاتا ہے۔ صابو بیوہ اور جندن یتیم ہو کر رو رو کے بالآخر خاموش ہو گئیں۔ دوسری بات کہ کوئی قریبی عزیز، چچا، ماموں بھی نہیں تھا جو بیوہ کے سر پر دوپٹہ اور یتیم کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ ویسے بھی غم تو غم ہی ہوتا ہے مگر جب آس پاس کوئی ایسا شخص نظر نہ آئے جو صابو کو سہارا دے اور جندن کے سر پر ہاتھ دھرے تو ایسی حالت میں اچھے بھلے ہوش گنوا بیٹھتے ہیں وہ تو بیچاری عورتیں تھیں۔

جبار بھی قرابت دار تو نہیں تھا مگر زمانے بھر کی حرص و ہوس اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ اگر معمولی سی ہمدردی سے مفت کا رشتہ اور تین مکان مل جائیں تو سودا مہنگا نہیں۔ ایک دن بیوی سے بات کی۔ ''اندھا کیا مانگے دو آنکھیں۔'' وہ بھی خوش ہوئی۔ جبار کی بیوی صابو سے ہمدردی جتانے لگی۔ جہاں بار بار ملنے سے پیار بڑھتا ہے وہیں سالن ترکاری اور موسمی پھل بھی دے دیتی۔ میل جول بڑھ گیا۔ ایک دن جبار کی بیوی عزت نے صابو سے کہا:

''صابو بہن مجھے جندن بہت پیاری لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے جندن میری اپنی بیٹی ہے۔''

صابو نے جواب دیا: ''عزت بہن، دکھیاروں کے ساتھ ہمدردی تمھارا فرض ہے۔ اگر تم مجھے سہارا نہ دیتیں تو ہم ماں بیٹی رو رو کر مر جاتیں۔''

عزت بولی: ''کئی مرتبہ دل میں خیال آیا مگر ڈر کے مارے تم سے بات نہیں کر سکی۔''

صابو نے پوچھا: ''کون سی بات؟''

عزت محتاط انداز میں بولی: ''پتا نہیں تمھارے دل میں کیا آئے۔ میں نہیں کرتی بات۔''

صابو بولی: ''واہ بہن، تمھارے سلوک نے مجھے زندگی دی ہے۔ مجھے تو تم سے توقعات ہیں مگر تم نے بات چھپا کر مجھے اداس کر دیا ہے۔ اچھا تمھاری مرضی۔''

www.facebook.com/groups/AAKUT/

عزت منت سے بولی: ''نہ بہن، ناراض نہ ہو۔ زمانہ بہت خراب ہو گیا ہے، لالچ کے بنا کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ ہوسکتا ہے، میری بات کو بھی لالچ سمجھا گیا تو میرے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔''

صابو بولی: ''بہن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔''

عزت بولی: ''نہیں صابو بہن۔ مجھے عقل روکتی ہے کہ زبان پر آئی بات نہ کروں تو بہتر ہے۔''

''اچھا بہن جیسے تمھاری مرضی، میں ایک بے سہارا بیوہ عورت کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''صابو بہن تم تو واقعی ناراض ہو گئی ہو۔''

''پھر بات کیوں چھپا گئی ہو۔''

''میں.....جندن.....''

''عزت بہن جھجکتی کیوں ہو بتاتی کیوں نہیں؟''

''بہن میں اقبال تمھیں دینا چاہتی ہوں۔'' آخر عزت نے کہہ ہی ڈالا۔

صابو نے عزت کو گلے لگا لیا اور بولی: ''یہ تو تم نے میرے دل کی بات کی ہے۔ تمھارے سلوک سے تو میں زندہ پھرتی ہوں۔ دودھ مکھن کھانے پینے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔''

اس بات پر دونوں کھل اُٹھیں۔ ساتھ ہی جبار کا مقصد بھی آج پورا ہو گیا تھا۔ پھر عزت ایک اچھا موقع دیکھ کر جندن کی منگنی کے کپڑے بھی دے آئی۔ رشتہ طے پایا تو میل جول اور بڑھ گیا اور یہ تعلقات مزید مضبوط ہو گئے۔

صابو اور جندن کو اچھا سہارا مل گیا لیکن کبھی کبھی تنہائی میں قادرے کو یاد کر کے صابو کے دو آنسو نکل ہی پڑتے۔ البتہ ان کو کوئی اور فکر نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار سال کا عرصہ گزر گیا۔

انسان اللہ کی فصل ہے وہ جیسے چاہتا ہے اسے کاٹتا رہتا ہے۔ اللہ کو یہ منظور تھا کہ جبار کی بیوی عزت کئی روز کی بیماری کے بعد فوت ہو گئی۔ اقبال کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ سیانے سچ کہتے ہیں کہ باپ مرا تو آدھا یتیم اور ماں مری تو پورا یتیم۔ اقبال کے ساتھ ساتھ جبار کی پریشانی بھی کچھ کم نہ تھی۔ اللہ کسی کا گھر برباد نہ کرے۔ ہنستا بستا گھر لمحہ بھر میں اجڑ گیا تھا۔ جوں جوں جبار سوچتا توں توں اس کی حالت خراب ہوتی جاتی کیوں کہ جندن بھی ابھی چھوٹی تھی۔ اس لیے وہ اقبال کی شادی بھی نہیں کر سکتا۔

صابو اکثر گھر آتی جاتی تھی۔ عزت کو مرے ابھی چوتھا دن تھا کہ صابو جبار کے گھر آئی تو اس ویران گھر میں جبار سر جھکائے اداس اور پژمردگی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی تو جبار نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ صابو پر نظر پڑی، آنکھیں ملیں تو ملی ہی رہ گئیں۔ کئی بار انسان پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جو بات وہ زبان سے نہیں کہہ سکتا وہ آنکھیں کہہ ڈالتی ہیں۔ آج بھی آنکھوں نے کوئی ایسی بات کی کہ آٹھویں دن جبار اور صابو کی شادی ہو گئی۔

دونوں ہی بہت خوش تھے۔ جبار کا اجڑا گھر پھر سے آباد ہو گیا۔ صابو خوش تھی کہ دونوں ماں بیٹی ایک ہی گھر میں آ گئیں۔ بیٹی بھی جدا نہ ہوئی، بہت اچھی گزر رہی تھی۔ جبار شروع ہی سے اچھا کھانے پینے اور پہننے کا عادی تھا۔ اب جو نئی شادی ہوئی تو ہر روز میوے، پھل، کھوپرا، بادام لے آتا۔ موسمی پھل اور ہر نئی چیز اس گھر میں آتی رہتی۔ دونوں ماں بیٹی مل کر کھاتیں اور عیش کرتیں۔ تین سال بعد اقبال کی بھی شادی ہو گئی۔ چاروں کی گھر میں خوش باش گزر رہی تھی۔ کوئی اداسی بھوک اور دکھ نہ تھا۔ جنداں ہر وقت چچا چچا کرتی اور لاڈلی بنی رہتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ چچا کے ساتھ ایسی بے تکلف ہوئی کہ جبار مٹھائیاں، پھل لاتا تو دلار کے ساتھ ہاتھوں سے چھین لینے سے بھی باز نہ آتی۔ جبار بھی جنداں کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا۔

دیہات کی زندگی اصل اور سادہ ہوتی ہے، جھجک نہ بناوٹ اور نہ جھوٹ۔ ہر بات میں سادگی، بیٹھنا اٹھنا، سب سادہ اور خوبصورت۔ گرمیوں میں جب حبس ہوتا تو آدھی رات تک بیٹھکیں اور ڈیرے آباد رہتے۔ بستی والے کھانے کا آخری لقمہ لیتے ہی مردانے میں آ جاتے۔ سرِ شام ہی چھوٹی بڑی چٹائیاں بچھ جاتیں اور لوگ ان پر بیٹھے اور لیٹے حقہ پیتے رہتے۔ گپیں ہانکتے، ٹپے ماہیے، حال احوال آپ بیتیاں، پرانے زمانے کے قصے کہانیاں، سیف الملوک، یوسف زلیخا، ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال کے قصے سناتے، مثنویاں گاتے، گھڑے بجتے اور تال سے تال مل جاتی۔

اقبال کی شادی کو سال ہونے والا ہو گا کہ ایک رات جبار جب آدھی رات کو اٹھ کر گھر جانے لگا تو اقبال چٹائی پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ جبار نے سوچا: میٹھی نیند سو رہا ہے نہ جگاؤں، جب جاگے گا تو خود ہی آ جائے گا۔ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ رات چاندنی تھی اور پوربی ہوا کے تیز جھونکے چل رہے تھے، موسم بہت نشیلا تھا۔ جبار مسرور گھر آیا۔ صابو اور جنداں میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھیں۔ چاندنی سارے گھر میں دھوبی کی دھلی سفید چادر لگ رہی تھی۔ پہلی چارپائی اقبال کی تھی جو خالی تھی، آگے جنداں کی اور پھر صابو کی چارپائی اور آخر میں جبار کی چارپائی تھی۔ جبار جنداں کے سرہانے سے گزرنے لگا تو اس کی نظر جنداں پر پڑ گئی۔

جنداں خوبصورت تو تھی ہی اوپر سے سولہ سترہ کا سن مگر اس چاندنی رات میں بے خبر سوئی جنداں کے دودھ جیسے رنگ کا نکھار یوں تھا کہ اگر کوئی زاہد بھی دیکھ لیتا تو اس کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ جاتی۔ جبار کو جنداں جنت کی حور لگی اور وہ خدا کے تراشے اس بت کو دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ وہ چارپائی کے ساتھ کھڑا کافی دیر حسن و جمال کے اس شہکار کو دیکھتا رہا۔

شیطان ہر انسان کے ساتھ ہے۔ وہ ہمیشہ پہلے آنکھوں پر دھاوا بولتا ہے۔ ادھر آنکھیں پھسلیں ادھر گمراہ ہوا اور عقل پر پردہ پڑا۔ آج یہی حالت جبار کی ہو گئی تھی۔ عقل ساتھ چھوڑ گئی۔ ہوس بڑھی تو وہ اس حسن کو قریب سے دیکھنے کے لیے جھک گیا۔ جبار کے ہاتھ جھکتے ہوئے چارپائی کی پٹی تک پہنچ گئے۔ نشہ بڑھا تو اس کے ہونٹ تڑپ کر جنداں کے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے۔ جنداں جاگ تو گئی مگر ہوش نہ آیا، نشے نے مدہوش

www.facebook.com/groups/AAKUT/

کر دیا۔ سانس تیز ہوئے۔ دل دھڑکنے لگے۔ نشہ بڑھا تو رہا سہا ہوش بھی جاتا رہا جو حیا کے شکوے پر بھی نہ آیا۔ ہوش آتا بھی کیسے! جبار بینھک سے ہی مدہوش ہو کر آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ گھر پہنچا تو شیطان نے اور ہی راستے پر ڈال دیا۔ ہوش آیا تو جبار چارپائی پر تھا۔

ضمیر جاگا تو اس نے خشک جوتا ہاتھ میں پکڑ کر جبار کو دے مارا۔ جبار کا سر اور ضمیر کا جوتا پھر ہر جوتے کی ہر چوٹ کے ساتھ ضمیر کی طعن و تشنیع۔ یہ کیا کیا ہے؟ اس حالت میں نیند کیسے آتی۔ جب علی الصبح نیند سے اٹھ کر بیٹھی ہوئی جندن کو جبار نے ڈرتے ڈرتے چور آنکھوں سے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ پتا نہیں اس کی مسکراہٹ تلوار تھی یا خنجر یا ظالم خونی برچھی۔ جو جبار کے ضمیر کے دل میں لگی تو وہ ہچکی لے کر مر گیا۔ جبار اٹھا اور باہر چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد گھر آیا تو اس کے ہاتھوں میں قلمی آموں کی ٹوکری تھی جس کو جندن نے بڑے نخرے اور دلار کے ساتھ جبار سے چھیننے کے انداز میں لے لیا۔

انسان مطلب پرست ہے۔ جندن پھل فروٹ کھاتی اور خوش ہوتی رہی، اس نے یہ تک نہ سوچا کہ وہ اس ذات کا اس ہستی کا اس مہربان کا حق چھین رہی ہے جس نے اسے نو ماہ پیٹ میں رکھا، تکلیفیں سہیں، پو ماہ کی راتوں میں نیند حرام کر کے سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر اسے دودھ پلایا۔ خود دکھ جھیلے، تکلیفیں سہیں مگر اس نے اولاد کو ہر سکھ دیا۔ جندن یہ سب باتیں بھول کر خوش خوراکی کی نذر ہو گئی تھی۔ مرد کو بھی اپنی عقل پر بہت ناز ہے۔ وہ ہمیشہ عورت کو ناقص العقل کہتا آیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عورت کی عقل اس کی گدی میں ہے۔ عورت اپنے مُنھ سے تو طلب کا اظہار نہیں کرتی مگر غلاظت کی پوٹ ہے۔ لیکن مرد نے کبھی اپنے اندر نہیں جھانکا وہ خود کو عقل مند سمجھتے ہوئے ایسے کام کیوں کرتا ہے۔ وہ عورت کو ماں، بہن، بیٹی کیوں نہیں مانتا۔ وہ عورت کو اپنی ہوس کی تکمیل کیوں سمجھتا ہے۔ پھر وہ انسان انصاف کیسے کر سکتا ہے جو پرائی آنکھ کے تنکے کو تو تاڑ لیتا ہے مگر اپنی آنکھ کے شہتیر سے بے خبر رہے۔ زبردست جو ہوا طاقت ور جو ہوا۔ سچ یہ ہے کہ طاقت ور کے سامنے سچ کون بولے۔

ایک سال بعد جبار نے صابو کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ ایسا کیوں نہ کرتا۔ گناہ کا دروازہ جو کھل گیا تھا۔ ٹھیک ہے اچھا نہیں کیا۔ ماس ہوتے چھیچھڑے کون کھاتا ہے؟ صابو بہت عرصے تک خوار ہوتی بیٹی کے احسان کے زخم چاٹتے چاٹتے مر گئی۔ جندن نے بھی بھلے مانس ہونے کا ثبوت دیا کہ ماں کا مُنھ دیکھنے بھی نہ گئی، ٹھیک تو کیا تھا جا کے سوتن کا مُنھ کیوں دیکھتی۔

مگر آج تو جندن کی چیخیں نکل گئیں، یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی ہمیشہ سیر کا سوا سیر تو دینا پڑتا ہے۔ جندن کو اپنے بیٹے اکبر کی شادی کیے ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ اکیس سال پہلے کا ڈرامہ جندن کے سامنے آ گیا۔ بلاشبہ پیر پیغمبر یہ کہتے آئے ہیں کہ جو اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسرے کے لیے بھی پسند نہ کرو۔ مگر کس کے پاس اتنا وقت ہے جو ان باتوں پر دھیان دے۔ ''میٹھا میٹھا ہپ، کڑوا کڑوا تھو۔''

آج جندن کی دھاڑیں نکل گئیں۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ سسر بوڑھا، خاوند بے راہ رَو، بیٹے کی عزت

خوار۔ اپنے سر پر پڑی تو ہڈیاں چیخ اٹھیں۔ وہ بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کہ اس کے بچپن کی سہیلی عزیزاں آ گئی۔ وہ جندن کو روتا دیکھ کر حیران ہوئی پھر ساتھ بیٹھ کر ہمدردی سے پوچھنے لگی۔

''بہن، کیوں رو رہی ہو؟ خیریت تو ہے؟''

''ہاں خیریت ہی ہے۔'' جندن نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''پھر یہ رونا کس بات کا؟''

''بس دل جو ہوا کسی لپیٹ میں آ گیا۔''

''بہن مجھ سے بات نہ چھپاؤ آج تمھاری حالت وہ نہیں۔''

''یہ تمھارا وہم ہے۔''

''پتا تو چل گیا۔''

''کس بات کا؟''

''یہی کہ میں غیر ہوں۔ مجھ پر اعتبار ہی نہیں۔''

''نہیں بہن یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر مکرتی کیوں ہو؟''

''کوئی بات ہو تو بتاؤں۔''

''مجھے تو بہت امیدیں تھیں۔ آج بات چھپا کر میری آنکھیں کھول دی ہیں۔''

جنداں نے عزیزاں کے مُنھ کی طرف دیکھا۔ ہونٹ پھڑکے مگر بول نہ سکی اور ایک بار پھر رونے لگی۔ وہ دیر تک سسکیاں بھر بھر کے روتی رہی۔ عزیزاں اسے گلے لگا کر دلاسے دیتی رہی۔

''عزیزاں بہن! خدا کرے مجھے موت آ جائے۔ مجھے پتا ہوتا تو میں اکبر کی شادی ہی نہ کرتی۔''

''وہ کیوں؟ کتنے ارمانوں سے تو تم نے بیٹا بیاہا ہے تمھاری عقل تو ٹھکانے پر ہے؟''

''بہن عقل کیسے ٹھکانے پر ہو سکتی ہے جس وقت بہو سوتن.....۔''

بات حلق میں اٹک گئی اور پھر چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ عزیزاں بار بار دلاسا دیتے بولی: ''بہن! تمھیں غلط فہمی ہوئی ہوگی یہ کوئی ماننے والی بات ہے خواہ مخواہ اپنا دل جلاتی ہو۔''

''عزیزاں بہن! دکھ تو یہ ہے کہ یہ غلط فہمی نہیں۔''

''عقل نہیں مانتی۔''

''عقل والی بات ہو تو عقل مانے مگر آنکھوں دیکھی بات کو کیسے غلط فہمی کہوں۔''

عزیزاں کانوں کو ہاتھ لگاتی، توبہ توبہ کرتی اٹھنے لگی تو جندن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی: ''بہن خدا کے واسطہ کسی کو بتانا نہیں۔

''واہ بہن جندن! بھلا، یہ کوئی کہنے والی بات ہے۔''

عزیزاں گھر لوٹ گئی۔ جندن بھی اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی دونوں کو یہ پتا ہی نہ چلا کہ اکبر نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔

اکبر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا کھانا، پینا، چین آرام سب کچھ حرام ہوگیا۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ پہاڑ بن گیا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ لیکن اگلے ہی روز لوگوں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ ایک نوجوان نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر دیا اور مقتول قاتل کا سگا باپ تھا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

یہ بات صرف جندن ہی جانتی تھی کہ ''مقتول قاتل کا سگا باپ تھا یا بھائی!''

☆☆☆☆

سرائیکی تخلیق وترجمہ: ڈاکٹر گل عباس اعوان

تکمیل

عورتوں کی ایک عادت بڑی عجیب ہے، وہ یہ کہ جب کوئی دوسری عورت انکے سامنے اپنے بچوں کی شرارتوں کا ذکر کرنے بیٹھے، تو وہ اپنے بچوں میں دنیا جہان کی تمام شرارتیں بیان کرنے لگیں گی اور اگر وہی عورت اپنے بچے کی خوبیاں بیان کرنے لگے تو وہ اپنے بچوں سے وہ خوبیاں بھی منسلک کریں گی، جو ان کے باپ دادا میں بھی موجود نہیں ہوں گی۔

سانول کی ماں بھی اس کی اسی طرح تعریف کیا کرتی تھی، پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، سانول کی تعریف کے علاوہ اسکی ماں کی بے بسی بھی نمایاں ہوتی جارہی تھی۔ وہ اب شبانہ کے چلے جانے کے بعد، سانول کو جھڑکا بھی کرتی تھی۔ وہ اکثر بے بسی سے کہتی، سانول! تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ شبانہ کو دیکھتے ہی تم اپنا آپ بھول جاتے ہو۔ مجھے تو بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ اسے دیکھتے ہی تم مجنوں سے ہو جاتے ہو۔ پر پانچ سال کے سانول کو ماں کی باتوں کی کیا سمجھ آتی۔

وہ صرف یہی جانتا تھا کہ شبانہ اسکی خالہ زاد (مسات شبو) ہے جو محض اسکی وجہ سے اس گھر میں آتی ہے۔ اور اس کے ساتھ کھیلنا چاہتی ہے۔ لہذا، جب بھی شبانہ ان کے گھر آتی وہ سارے کام چھوڑ اس کے ساتھ رل سا جاتا تھا۔ جتنا وقت شبانہ (شبو) اس کے گھر رہتی، وہ اس کی ہر فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ اس کے ساتھ سٹاپو کھیلتا۔ گو کہ اسے ''گیٹے'' کھیلنے نہیں آتے، پھر بھی وہ اس کے ساتھ کھیلتا۔ وہ مشکل گیٹے ''کٹے'' کو ہاتھ کے نیچے سے گزار نہ سکتا اور ہار جاتا، پر سچ تو یہ ہے کہ اسے اس ہار میں بھی مزا آتا۔

شبانہ (شبو) ''رسّے'' پر سے اُچھلتے ہوئے بہت خوشی محسوس کرتی، سانول اس کے جانے کے بعد، ایک ایک چیز کو سنبھال کر رکھتا۔ اور دوسرے دن شبانہ (شبو) کے آتے ہی، اس کے مانگنے یا پوچھنے سے قبل ہی وہ چیزیں لا ''حاضر'' کرتا۔ اس کے جانے پر، چیزیں سنبھال سنبھال کر رکھتے وقت، وہ یوں محسوس کرتا، جیسے شبانہ (شبو) اس کے گھر ہی رہ رہی ہو۔ اور وہ شبانہ (شبو) کو دنیا والوں سے چھپا کر، اپنے پاس رکھ رہا ہے۔

www.facebook.com/groups/AAKUT/

وقت گزرتا گیا۔ وقت نے کب کسی کے ساتھ وفا کی ہے۔ بیس سال بعد تو، رشتوں کی لغت ہی بدل جاتی ہے۔ بہتے دریاؤں کا پانی، سمندروں سے جا ملے، تو واپس نہیں لوٹتا۔ پر سانول کے دل کی دھڑکن شبانہ (شبو) کو دیکھتے ہی تیز ہو جایا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خیالات کی دنیا حقیقی دنیا سے زیادہ دلکش ہوا کرتی ہے۔ پر شبانہ (شبو) تو اس کے خیالات سے بھی زیادہ حسین تھی۔

جب کبھی شبانہ (شبو) کوئی میٹھی نمکین بنی ہوئی چیز پلیٹ میں ڈال، اس کے گھر دینے آتی تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ پلیٹ سانول کے ہاتھ میں تھمائے، اور سانول اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر اس سے پوچھے مسات! (اری کزن) کیا لائی ہو۔ اور اس کے جواب دینے سے پہلے ہی سانول، اپنی ماں سے کہتا کہ اماں! ہم بھی برتن خالی نہیں بھیجیں گے۔ اماں! سویاں پکا دینا، میں خود خالہ کے گھر دینے جاؤں گا۔

جب سانول کی ماں گھر نہیں ہوتی تھی تو واقعی سانول پلیٹیں تھام لیتا، مگر شبانہ (شبو) کے ہاتھ سے پلیٹیں لیتا نہیں تھا۔ دونوں کافی دیر تک پلیٹیں تھامے کھڑے رہتے۔ محسوسات کی رو، برقی رو کی طرح پلیٹوں میں گزرتی ہوئی، ان کے جسموں میں سرایت کرتی رہتی۔ کچھ دیر بعد سانول پلیٹیں لے لیتا، تو شبانہ (شبو) اپنے دوپٹے کے پلو، مروڑتی رہ جاتی۔ سانول ان ہونی کی دعائیں مانگتا ہمیشہ یہی کہتا کہ کاش وقت رک جائے۔ پر وقت نے تو گزرنا ہے، اور وقت کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا۔

سانول کی ماں، اس ساری صورتحال سے بخوبی واقف تھی۔ وہ سانول سے اکثر کہا کرتی کہ تمہارا خالو، ہمیں اچھا نہیں سمجھتا۔ وہ کبھی بھی شبانہ (شبو) کا رشتہ ہمیں نہیں دے گا۔ وہ اکثر سانول کو سمجھاتی کہ تمہارا خالو اکرم بہت لالچی شخص ہے، وہ شبانہ (شبو) کا رشتہ اپنے بھائی کے گھر کرنا چاہتا ہے تاکہ وٹے سٹے کی صورت میں دونوں بھائیوں کی زمینیں ان کے اپنے پاس رہیں۔

پھر، یوں ہوا کہ شبانہ (شبو) کا نکاح لالو کے ساتھ ہو گیا۔ سانول وقت کو نہ روک سکا اور نہ ہی اپنے دل کی دھڑکن کو۔ اس مرتبہ شبانہ (شبو) خود سویاں پکا کر، خالہ تاجو کے گھر آئی تو سانول نے آگے بڑھ کر پلیٹیں نہ تھامیں۔ محض شبانہ (شبو) کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہ گیا۔ شبانہ (شبو) کی آنکھیں، اسے اعتبار کے سارے پیغام دے رہی تھیں، مگر سانول کی آنکھوں کا سیلاب ہر چیز، بہائے لے جا رہا تھا۔ آج شبانہ (شبو) سے کسی نے نہیں کہا تھا کہ ''برتن خالی نہیں جائیں گے۔''

شبو، خالی برتن تو لے آئی، مگر اس کی امیدوں کے برتن بھرے ہوئے تھے۔ شبانہ (شبو) اب بھی خالہ

www.facebook.com/groups/AAKUT/

کے گھر آتی تھی۔ کبھی کبھار سانول بھی گھر پر ہوتا تھا، مگر اب وہ آگے بڑھ کر شبانہ (شبو) کے ہاتھ سے برتن نہیں لیتا تھا۔۔۔۔ پھر شبانہ (شبو) کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ آج وہ جان بوجھ کر اس وقت آئی، جب سانول گھر پر تھا۔ گھر میں سب موجود تھے، مگر اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ پلیٹیں لے کر سیدھی سانول کے پاس گئی۔ اور جاتے ہی کہا کہ سانول آ! میری جان بھی تمہاری ہے اور میرے سانس بھی۔ میری ایک ارداس ہے کہ میری امیدوں کے برتن کبھی خالی نہ ہونے دینا۔ یہی بات کہہ کر، وہ فوراً واپس چلی گئی۔

سانول، کو یوں لگا، جیسے وقت رک گیا ہو۔ پلیٹوں کے دوسرے سرے پر شبانہ (شبو) کے ہاتھ ہوں۔ اور ایک برقی لہر، دونوں کے جسموں سے گزر رہی ہو۔ پھر وہ دن بھی آ گیا، جب شبانہ (شبو) سسرال گھر جا پہنچی۔ اور ایک دن سانول بھی دلہا بن گیا، دلہن لے آیا۔ شبانہ (شبو) ایک مرتبہ سانول کی شادی کے بعد، ساگ پکا کر لے آئی، پر، جس وقت سانول کی بیوی ''جندو'' نے یہ کہہ کر شبانہ (شبو) سے ساگ کا کٹورا لے لیا کہ اب برتن میرے ہاتھ دیا کرو، تو شبانہ (شبو) پھر کبھی کوئی چیز خود دینے نہ آئی۔ ہاں البتہ پندرہ سال بعد بھی، وہ کسی نہ کسی بہانے، کوئی نہ کوئی چیز، پکا کر سانول کے گھر بھجوا دیتی۔ اور سانول بھی اپنے بچوں کے ہاتھ کوئی نہ کوئی شے، بنوا کر بھجوا دیتا تھا۔

اب شبو (شبانہ) بن چکی تھی۔ اس کے تین بچے تھے۔ سانول بھی پچاس کے پیٹے میں تھا۔ شبو کے بال تو پہلے ہی چمکیلے تھے، مگر اب کھری چاندی کی طرح چمکتے تھے۔ زندگی خاموشی سے اپنے اپنے راستوں پر رواں دواں تھی کہ ایک دن ریسکیو 1122 کی گاڑی الارم بجاتی آ پہنچی۔ مائیک سے نوجوان آفیسر عنایت بلوچ کی آواز بلند ہو رہی تھی، وہ اعلان میں بار بار اپیل کر رہا تھا کہ خدا کے لیے، یہ بستی میرانی خالی کر دو۔ ایک عظیم سیلاب آ رہا ہے۔ آپ کے وہم و گمان سے بھی بڑا سیلاب آ رہا ہے۔ ایسا سیلاب آپ کے بزرگوں کے زمانے شاید 1916ء میں یا 1929ء میں آیا ہوگا۔ بستی خالی کر دو۔

نشیبی علاقے کے لوگ، صدیوں سے دریا کی دھمکیاں بھی سنتے آئے ہیں اور ان دھمکیوں کا مقابلہ بھی کرتے رہے ہیں۔ لہذا انہوں نے نوجوان آفیسر عنایت بلوچ کے اعلان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ البتہ جب 28 جولائی 2010ء کی رات سیلابی ریلہ لیہ کی حدود میں داخل ہوا تو یہاں کے لوگوں کو اس بات کا ضرور اندازہ ہو گیا کہ اب کی مرتبہ دریا کے تیور غضب ناک ہیں۔ اگست 2010ء کے پہلے ہی ہفتے بستی کی تقریباً 90 فیصد آبادی نقل مکانی کر گئی تھی۔ سانول کے گھر والے بھی لیہ شہر آ گئے، مگر سانول ابھی تک اپنے گھر

www.facebook.com/groups/AAKUT/

کے تھلے (چبوترے) پر ٹکا ہوا تھا۔

ایک صبح جب وہ اپنے تھلے پر بیٹھا ہوا تھا اور، اُس کی نگاہ مسلسل سامنے والے تھلے کا (چبوترے) کا طواف کر رہی تھی، یکدم اسے نظر آیا کہ اکرم، لالو، شبو اور ان کے گھر والے، اپنے چبوترے سے اتر کر، پانی میں اتر آئے ہیں۔ سانول نے مڑ کر اپنے گھر کی طرف نہ دیکھا۔ وہ دروازے کھلے چھوڑ، پانی میں اتر گیا۔ جب یہ لوگ گھر کے سامنے والی سڑک پر چڑھے تو، پانی گھٹنوں گھٹنوں اور کہیں کہیں کمر کے برابر تھا۔

میرانی قدیم کے اسکول سے پانی میں تیزی آنا شروع ہوگئی۔ اکرم لالو اور شبانہ کے ہاتھ میں ایک ایک بچہ تھا۔ سانول نے ان کے دو ٹرنگ، سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اکرم نے سب کو آواز دے کر کہا، سنبھلنا۔ دریا (کے) اپنے جوبن پر ہے۔ ''کما'' بڑے دریا سے نکلنے والا ایک نالہ تھا، جو طغیانی کے دنوں میں بہہ نکلتا اور آج کما دریا، بن ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سب لوگوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیے۔ سانول اور شبو ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ شبو، نے سانول کے چولے کا پلو، پکڑ لیا۔

اس لمحے بوڑھے اکرم کا پاؤں پھسلا تو شبو کے بیٹے کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بچے نے چلا کر کہا اماں! غیر تیرا اک شبو نے ایک مرتبہ مڑ کر سانول کو دیکھا اور بچے کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ سانول نے بھی ٹرنگ پھینکے اور اس نے بھی شبو کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔

بچے کو تو فوراً بچا لیا گیا، مگر سہ پہر تک شبو اور سانول کی لاشیں نہ ملیں۔ شام کے وقت ریسکیو 1122 کی ٹیم نے دونوں لاشوں کو اس حالت میں نکالا، کہ سانول نے شبو کو کمر میں ہاتھ ڈال کر یوں اٹھا یا رکھا تھا، جیسے دولہا، دلہن کو کچاوے سے اتارتا ہے۔ شبو کی بھی دونوں باہیں سانول کے گلے میں تھیں، جیسے وہ، سیج پر سکون نیند سو رہی ہو۔

ساری بستی میں باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کچھ نے کہا کہ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ اس نے تو ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر، جان قربان کر دی مگر سانول نے تو، خودکشی کی، کچھ کا کہنا تھا کہ دونوں نے خود کشی کی، پر سانول کی بیوی کا کہنا تھا کہ سانول نے خودکشی نہیں کی، بلکہ اس نے تو اپنی ذات کو ڈھونڈ لیا ہے اور آج تو اس کی تکمیل ہوئی ہے۔

☆☆☆☆

مسرّت کلانچوی
سرائیکی سے ترجمہ: سلیم شہزاد

بند کھڑکی

ماسٹر کریم بخش سیانے چالاک، ہوشیار اور جلد سبق یاد کرنے والے بچّوں کے لیے جتنا سخت تھا، بھولے بھالے کند ذہن بچّوں کے ساتھ اُسے اُتنا ہی پیار کرتا تھا۔ وہ اکثر ایسے بچّوں کو چھٹی کے بعد بھی پڑھاتا۔ سب بچّوں کو سکول سے بھیج کر وہ کسی بچّے کو اکیلا بٹھا کر پیار سے سبق یاد کرواتا۔ سارا محلہ ماسٹر کریم بخش کے گُن گاتا۔ ماسٹر کریم بخش کا باپ اُس کے بچپن میں ہی مر گیا تھا۔ اُس کی ماں نے دُوسری شادی کی جس میں سے عائشہ تھی جسے سب آشاں کہہ کر بلاتے تھے۔ اور پھر آشاں کا باپ اُسے بھی یتیم کر گیا۔ ماں نے دوکان کے کرایے سے اُنھیں بڑی مشکل سے پالا دونوں جوان ہوئے۔ آشاں محلے کی لڑکیوں کو سلائی کڑھائی سکھاتی اور کریم بخش بھی ماسٹر لگ گیا

۔اور پھر ایک دن اماں نے بھی آنکھیں مُوند لیں۔ کریم بخش کو ماں کے مرنے کا قلق بہت تھا۔ وہ یہ سوچ کے غم کے اندھے کنوئیں میں گر جاتا کہ جس گھر میں وہ رہتے، جس دوکان کے کرایے پر گزارا کرتے وہ آشاں کے باپ کی تھی جسے وہ اپنی بیماری کے دوران آشاں کے نام کر گیا تھا۔ اب آشاں چاہتی تو اپنی شادی کے بعد کریم بخش کو گھر سے چلتا کر سکتی تھی۔

آج تو آشاں نے بھی پُرسے کے لیے آئے رشتے داروں کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ رات کو اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ دونوں جو بچپن میں آنکھ مچولی اور گاڑی گاڑی کھیلتے، ایک تھالی میں کھاتے اور ایک کٹورے میں پیتے تھے، اب ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے تھے۔ پہلے آشاں خود کریم بخش کا کھانا لایا کرتی تھی لیکن اب کسی شاگرد کے ہاتھ بھیجنا شروع کر دیا۔ اماں کا چہلم ہوا تو چاچا جندن شاہ نے ایک طرف لے جا کر کریم بخش کو بہت سی باتیں سمجھائیں۔ جن میں سے سب سے اہم بات یہ تھی کہ جوان بہن کو گھر میں بٹھانے والے پر اللّٰہ کا عذاب نازل ہوتا ہے اور ہر مہینے وہ میکے میں جتنے کپڑے دھوئے گی اُتنے ہی رستے وارث کی گردن میں باندھے جائیں گے۔

www.facebook.com/groups/AAKUT/

''تم کیا سمجھتے ہو چاچا۔'' کریم بخش غصّے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔'' مجھے احساس نہیں ہے۔ سیّدوں کے رشتے کی خاطر اب تک اماں نے اُسے گھر بٹھائے رکھا۔ اب غیروں میں بہن بیاہ کر اپنے گلے میں عذاب ڈال لوں اور اُس کا بھی خانہ خراب کروں۔ جب تمہیں سیّدوں میں کوئی رشتہ مل جائے تو مجھے بتانا۔''

آشاں دھیری دھیری آواز میں لڑکیوں کو یوں درس دیتی جیسے اُجاڑ میدان میں کوئی اکیلا بیٹھا سسکیاں بھرتا ہو یا جیسے تھل میں کوئی کونج راہ بھول جانے پر درد بھری آواز میں بچھڑی ڈار کو پکارتی یا جیسے پہلی مرتبہ پنجرے میں بند ہونے والی چڑیا چُوں چُوں کرتی ہے۔

اور پھر یہ آواز بھی بند ہوگئی اور اُس نے وقت سے پہلے لڑکیوں کی چھٹی کر دی اور اپنے بستر پر آن گری۔ داوی بختو نے بتایا تھا کہ چاچا جندن شاہ کسی غریب سیّد کا رشتہ ڈھونڈ آیا تھا جس پر کریم بخش نے اُس کو اچھی خاصی جھاڑ پلائی۔

''میری بہن زمین جائیداد والی ہے۔ کوئی جوڑ تو دیکھتے اور پھر وہ نیک اور معصوم ہے۔ کوئی اللّٰہ کا نیک اور سیدھا سادھا بندہ ہی اُس کا جوڑ ہو سکتا ہے۔''

اور پھر اللّٰہ کے نیک بندے کے انتظار میں کچھ سال اور گزر گئے۔ دِن کو حویلی میں اماں کی لگائی ہوئی بوڑھی بیری ہَوا کے ساتھ سَاں سَاں کرتی تو یُوں محسوس ہوتا کہ اماں ہولے ہولے رو رو کر آشاں کے لیے امان مانگ رہی ہو۔ رات کو تارے نکلتے تو لگتا جیسے اماں کے آنسو آسمان پر موتی بن کر پھیل گئے ہوں۔

کریم بخش اور آشاں ایک دُوسرے کے لیے زیادہ اجنبی ہوتے گئے۔ کریم بخش کا دل بچّوں کے ساتھ لگتا گیا اور آشاں کا دِل اُتنا ہی بچّیوں سے کھٹا ہوتا گیا۔ کوئی یار دوست کریم بخش کو شادی کا کہتا تو وہ چڑ جاتا۔''میں اِتنا بے غیرت نہیں۔ یتیم بہن کو گھر بٹھا کر خُود سہرے باندھ لوں۔''

''بھائی ہو تو ایسا۔'' کوئی تعریف کرتا تو کوئی طنز کے ساتھ مسکرا پڑتا۔ اماں کی تیسری برسی پر چاچا جندن شاہ کریم بخش کو پھر ایک طرف لے گیا۔

''کچھ خبر بھی ہے کہ لوگ کیسی باتیں بنا رہے ہیں۔ لوگ تو سگے بہن بھائیوں کو نہیں بخشتے تم تو پھر بھی۔۔۔'' چاچا جندن شاہ نے بہت ڈرتے ڈرتے بات کی۔ اُس کا خیال تھا کہ کریم بخش گرم لُو کی طرح تپ کر اُس کے گلے پڑ جائے گا مگر وہ بالکل خاموش رہا، صرف اتنا بولا: ''پھر؟''

''پھر تم ہی کہیں شادی کر لو۔ لوگوں کَہ منہ بند کرنے کی خاطر ہی سہی۔'' رات ہوئی۔ برسی پر آئے رشتے دار واپس چلے گئے۔ روز کی طرح صحن پھر ویران ہو گیا۔ ہَوا بند تھی۔ بیری کی سَاں سَاں بھی رُک گئی تھی۔ آسمان پہ تاروں پر میلے بادلوں نے اپنی چادر بچھا دی تھی۔ دھرتی بہت ٹھنڈی تھی۔ اُس دھرتی پر کچھ دیر

کریم بخش ننگے پاؤں کھڑا رہا اور پھر جوتا پہن کر آشاں کے کمرے کی طرف گیا اور آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

''جی بھائی۔''

''دروازہ کھولو۔ضروری بات کرنا ہے۔''

کچھ دیر دُوسری طرف سے سانسوں کی آواز آتی رہی اور پھر آشاں نے دروازہ کھول دیا اور ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ کریم بخش آہستگی سے چلتا ہوا اُس کی چارپائی پر جا بیٹھا۔جس چارپائی پر اماں کے ایک بازو پر کریم بخش اور دُوسرے بازو پر کریم بخش سر رکھ کر سوتے تھے۔

اُس چارپائی کا بستر بھی لاش کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

''بیٹھو۔'' کریم بخش نے بمشکل کہا۔آشاں نیچے زمین پر بچھی صف پر بیٹھ گئی۔''میں تو بہت پہلے سے چاہتا تھا کہ تمہیں بیاہ دوں مگر تم تو خاندان کے رسم ورواج جانتی ہو۔مگر اب میں مجبور ہو گیا ہوں۔۔۔''

آشاں کی آنکھوں میں اُمید کی ایک کرن چمکی۔''کہ لوگوں کی بات مان لوں۔۔۔''

آشاں کی آنکھوں کی چمک سِوا ہوگئی۔

''میں خُود ہی شادی کرلوں۔''

دِیا بجھ گیا اور آشاں کے مُنہ پر اندھیرا پھیل گیا۔

''مگر میں شادی تمھاری مرضی سے کروں گا۔جو لڑکی تم پسند کرو گی اور ویسے بھی ماں کے بعد یہ حق بہنوں کا ہوتا ہے۔''

''ماں کے بعد۔۔۔'' آشاں سسکیاں بھرتے بھرتے رونے لگی خبر نہیں کتنے آنسو وہ آنکھوں کے دریا میں سمیٹے کھڑی تھی۔بند ٹوٹ گیا اور آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔کریم بخش نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر نکل گیا۔

پھر کچھ مہینے بعد ہی آشاں، صاحبو کو بھابھی بنا کر گھر لے آئی۔صاحبو غیر تھی مگر اپنی ذات برادری کی تھی۔صحن کی خاموشی ٹُوٹ گئی۔ڈھول باجوں کا بہت شور مچا۔دلہن کی پائل کی چھن چھن نے برف کی سِلوں پر چنگاریوں کا مِینہ برسا دیا۔مگر یہ چھن چھن، یہ چنگاریاں جیسے کرم بخش پر نہیں آشاں پر برس رہی تھیں۔اُس کی آنکھوں میں خوابوں کی بارات چلنے لگی۔

کریم بخش اب بھی سارا دن بچوں کو پڑھانے میں مصروف رہتا۔شام کو لوٹتا تو صاحبو کی نظروں سے نظریں نہ ملا سکتا۔رات ہوتی تو آشاں بھائی، بھابھی کی خدمت کے لیے صحن میں لگے نل سے پانی بھر کے

www.facebook.com/groups/AAKUT/

غسل خانے میں رکھ دیتی۔ مگر صبح بالٹی ویسی ہی بھری دیکھ کر وہ حیران رہ جاتی۔

صاحبو کی آنکھوں میں کچھ عرصہ تک تو شام کا اندھیرا بھرا رہا مگر پھر وہاں تارے چمکنے لگے۔ وہ سارا دِن آشاں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی رہتی۔ دیر تک اُس کے بالوں میں تیل لگاتی۔ کنگھی پھیر کر اُس کی چوٹی بناتی۔ اپنے کپڑوں میں سے کچھ کپڑے بھی اُسے سی کر دیے۔

پھر صاحبو کے خاندان سے آشاں کے لیے بھی ایک رشتہ آ گیا۔ مگر صاحبو نے کریم بخش تک بات پہنچنے سے پہلے ہی کہہ دیا: ''یہ تو وتہ سقہ بن جائے گا۔ میں یہ کام کبھی نہیں ہونے دوں گی۔''

پھر اُن کی اپنی برادری سے ایک رشتہ آیا۔ مگر اُس پر بھی صاحبو نے نہ کر دی کہ لڑکا اُس کی شہزادیوں جیسی نند جتنا خوبصورت نہیں تھا۔ سال ہونے والا تھا۔ بڑی بوڑھیاں صاحبو کو صحن میں بھاگتے دوڑتے بھاری بھاری اشیاء اُٹھاتے سیڑھیاں چڑھتے دیکھتیں تو اُنگلیاں دانتوں میں دبا لیتیں اور کوئی اُسے جھڑک بھی دیتی کہ دُلہن، آرام کے ساتھ، دھیان کے ساتھ۔ مگر جھڑکنے پر صاحبو زور سے ہنستی۔ اُس کی ہنسی میں جانے کیا بات ہوتی جو کسی کو سمجھ نہ آتی۔

آج صبح سویرے کریم بخش کی طبیعت خراب تھی۔ ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ بچوں کو پڑھانے میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ چھٹی سے پہلے ہی وہ گھر چل پڑا۔ وہ گھر پہنچ کر صاحبو سے اپنا سر دبوانا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے کمرے میں نظر دوڑائی تو صاحبو اُسے نظر نہ آئی۔ آشاں کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کریم بخش نے کھڑکی کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ آشاں اور صاحبو ایک دُوسرے کے ساتھ لپٹ کر سو رہی تھیں۔

☆☆☆☆

www.facebook.com/groups/AAKUT/

ڈاکٹر غزالہ احمدانی
سرائیکی سے ترجمہ: سلیم شہزاد

صدی کا سفر

اُٹھو، جاگو۔۔۔ مجھے کہیں دُور سے آواز آئی۔۔۔ اُٹھو، بیٹا!۔۔۔ کون۔۔۔؟ اُٹھو۔۔۔ میری بیٹی۔۔۔ آواز نزدیک ہوتی گئی۔۔۔ کون۔۔۔؟۔۔۔ کون ہے۔۔۔؟ میں نے جاگنے کی کوشش کی۔۔۔ فرید! ۔۔۔ جواب ملا۔۔۔ کون فرید۔۔۔؟۔۔۔ میں نے پُوچھا۔۔۔ جواب ملا۔۔۔ کوٹ مٹھن والا فرید۔۔۔ تمہارا خواجہ جی۔۔۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں اُٹھی۔۔۔ اور باادب ہو بیٹھی۔۔۔ آپ نے زحمت کیوں کی خواجہ جی۔۔۔ بیٹی، اُٹھ، نیند چھوڑ۔۔۔ حکم خواجہ جی۔۔۔ دیکھ بیٹی، قتل ہو گئے۔۔۔ فرید سائیں، وہ تو روز ہوتے ہیں۔۔۔ نہیں میری بیٹی۔۔۔ بیٹے نے ماں کو مار دیا۔۔۔ دیکھ بیٹی، میرے وَسیب کا دُکھ۔۔۔ اب میں پُوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔۔۔ خواجہ سائیں، میں اِس دُکھ کو سمجھتی ہوں۔۔۔ بیٹا، تُو سمجھ سکتی ہے کہ مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہو گی۔۔۔ ماں بیٹے کو کتنی تکلیفوں سے جنتی ہے۔۔۔ پھر پالتی ہے۔۔۔ اپنا دُودھ پلاتی ہے، اُس کے کپڑوں پر کڑھائیاں کرتی اور اُسے چلنا سکھاتی ہے۔۔۔ پیروں فقیروں کی اُس کے لیے منتیں اُتارتی ہے کہ وہ جوان ہو اور اپنی ماں کو مار ڈالے۔۔۔ فرید سائیں، کچھ کرتے ہیں۔۔۔ کچھ کرتے ہیں۔۔۔!

خواجہ سائیں بولے۔۔۔ ماں کو کالا کر کے مار دیا۔۔۔ جی ہاں خواجہ سائیں۔۔۔ یہ میرے وَسیب کا دُکھ ہے، ماں کالی۔۔۔ بیٹا قاتل۔۔۔ میری رُوح کو تکلیف پہنچتی ہے۔۔۔ اِس غربت، بھُوک اور بے انصافی کو دیکھ دیکھ کر۔۔۔ خواجہ سائیں، دُعا کریں۔۔۔ میری بیٹی، تم عمل کرو۔۔۔ خواجہ نے فوری جواب دیا۔ عورتوں کا قبروں پر آنا۔۔۔ قبروں کو چُومنا اور سجدہ کرنا۔۔۔ بیٹا، مجھے تکلیف دیتے ہیں۔۔۔ قبلہ سائیں۔۔۔ مجبور کیا کچھ نہیں کرتا۔۔۔ میں نے عاجزی سے کہا۔۔۔ خواجہ سائیں کچھ کرتے ہیں مگر یہ رسم و رواج، عورتوں کا لین دین، مذہب سے دُوری۔۔۔ اِس کو ٹھیک کرتے ہیں۔۔۔ میری بیٹی، بھائیوں کا ساتھ لے لو۔۔۔ بیٹا جی۔۔۔ ہاں خواجہ سائیں۔۔۔ آپ رستہ دکھائیں۔۔۔ خواجہ پیر فرید سائیں آگے چلتے جاتے

ہیں اور میں اُن کے پیچھے۔۔۔چلتی جاتی ہوں۔۔۔چلتی جاتی ہوں۔۔۔دیکھتی ہوں۔۔۔میرا وَسیب پھُولوں سے بھر گیا ہے۔۔۔میگھ ملہار ہے میانوالی سے کوٹ مٹھن تک۔۔۔شادیانے بج رہے ہیں۔۔۔لوگ جھومر ڈال رہے ہیں۔۔۔خواجہ سائیں، یہ کیا؟۔۔۔چلتی آؤ۔۔۔دیکھتی آؤ۔۔۔چلتی آؤ۔۔۔فرید سائیں، یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔۔؟۔۔میری بیٹی، بالکل سرائیکی وَسیب میں ہیں۔۔۔یہ خُوش حالی کہاں سے آ گئی۔۔۔ میں نے حیرانی سے پُوچھا۔۔۔بیٹا، محنت اور محبت کی وجہ سے۔۔۔پہلے یہاں کے لوگ محنت سے بھاگتے تھے۔۔۔اُنھوں نے اپنے حقوق حاصل کر لیے ہیں۔خواجہ سائیں، کون سا سن ہے۔۔۔کون سی صدی ہے۔۔۔بیٹا، اِسی صدی کی آخری دھائی ہے۔۔۔یہی صدی جو چل رہی ہے۔۔۔خواجہ سائیں، آگے چلتے جاتے ہیں اور میں اُن کے پیچھے پیچھے۔۔۔ہم سب۔۔۔خواجہ سائیں، یہ کیسے ہوُا؟۔۔۔بیٹا، چلتی آؤ۔۔۔ چلتی آؤ۔خواجہ صاحب، ہم کہاں پہنچ گئے ہیں۔۔۔؟۔۔۔کوٹ مٹھن۔۔۔خواجہ سائیں کی دَرگاہ پر۔۔۔ فرید سائیں، میں آواز دے رہی ہوں۔۔۔ مجھے جواب نہیں ملتا۔۔۔میں خُود سوال اور خُود جواب بن گئی ہوں۔۔۔

☆☆☆☆

حبیب موہانہ
(سرائیکی سے ترجمہ) خورشید ربانی

جٹی چڑیا

مکندا ہندو دراہن کے نامور جاگیرداروں اور عمائد میں سے تھا۔ اس کی بیٹھک پر عوام کی اکثریت کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ بہت شریف اور نفیس انسان تھا۔ اس کی ایک اہم خوبی یہ بھی تھی کہ وہ جانوروں اور پرندوں کا گوشت نہیں کھاتا تھا۔ اس کو خدا کی مخلوق سے بہت محبت تھی۔ اس کی بیٹھک پر چڑیوں اور کوؤں کے لیے دانا پانی الگ اور مخصوص برتنوں میں رکھا ہوتا تھا۔ صادق اور اس کے ساتھی بچے قبرستان سے چڑیاں پکڑ کر مکندے کے پاس لاتے۔ مکندا انہیں روپیہ روپیہ دے کر چڑیاں خرید لیتا۔ بچے دکان سے اپنے لیے کوئی کھانے کی چیز لیتے اور گھر بھاگ جاتے۔ ساون جب بھی آتا دراہن کے بچوں کی عید ہوتی۔ بارش سے چڑیوں کے پر اس طرح بھیگ جاتے جیسے پانی سے ان کے پر باندھ دیئے گئے ہوں۔ بارش سے بھیگی چڑیاں قبرستان میں پیلو کے درختوں پر مینڈکوں کی طرح کودتی پھدکتی پھرتی تھیں۔ بارش کے دن بچوں کی ٹولیاں قبرستان کا رخ کرتی نظر آتیں۔ وہ سردی سے کپکپاتی چڑیوں سے اپنی جیبیں بھرتے اور مکندے کے دروازے پر آ دھمکتے۔ چڑیوں کے بدلے روپیہ روپیہ دے کر وہ دراہن کی چڑیوں کو قربان ہونے سے بچائے ہوئے تھا۔ جب کہ دوسرے علاقوں میں بارش کے دن چڑیوں کو پکڑ کر مارنے اور کھانے کی روایت ابھی جاری تھی۔ بچے چڑیاں فروخت کر کے ثواب بناتے تھے۔ یہ دن ان کے لیے عید سے کم نہ ہوتا، صادق کا والد حق نواز پہلے تو اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا لیکن ایک دن گھر کے بھائی بھی تقسیم ہو گئے۔ حق نواز کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ گھر کی بچی کھچی گندم بھی ختم ہو گئی۔ وہ مکندے کی بیٹھک سے چڑیوں کے لیے گندم سے بھری کناریاں خالی کرتا اور گھر لے آتا۔ کچھ دنوں سے صبح سویرے خالی برتن دیکھ کر مکندے کو شک ہو گیا۔ اس نے چور پکڑنے کے لیے بیٹھک میں چھپ کر بیٹھنے کی ٹھان لی۔ حق نواز پکڑا گیا۔ اس نے مکندے کو اپنا دکھڑا سنایا ''سیٹھ جی میں غریب ہوں۔ پہلے ہم سب بھائی ایک ساتھ رہتے تھے۔ ایک ہی برتن میں کھانا کھاتے۔ اب ہر ایک کا الگ رخ ہے۔ سب جدا جدا رہنے لگے ہیں۔ دوسرے بھائی اچھی طرح گزر بسر کر رہے ہیں۔ وہ

مزدوری بھی کر سکتے ہیں مگر میں بہت سست مزاج اور کاہل ہوں۔ جب بوٹی (بھنگ) پی لیتا ہوں تو سارا گاؤں اونگھتا نظر آتا ہے۔ اپنے جوگا بھی نہیں رہ پاتا تو اور کیا کروں۔'' مکندے نے یہ سن کر اسے تسلی دی، ''اچھا تم فکر نہ کرو میں تمہیں روزگار دوں گا۔'' ''سیٹھ جی! روزگار تو درابن میں بہت ہیں لیکن میں کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ بھنگ پینے کے بعد تو ناک پر بیٹھی مکھی بھی نہیں اڑا سکتا۔'' ''کام آسان ہوگا۔'' ''سیٹھ جی! آسان کام تو صرف روٹی کھانا ہے، بھنگ پینا ہے۔'' ''تم فکر نہ کرو۔ کام تمہاری حیثیت کا ہوگا۔ بیٹھک کی صفائی کرنا، پانی بھرنا' حقہ تازہ کر دینا اور مہمانوں کی آؤ بھگت!'' حق نواز نے شرائط مان لیں۔ یوں اس کی زندگی آسانی سے گزرنے لگی۔ مکندے کا ایک ہی بیٹا تھا جو کلکتہ میں وکیل تھا۔ اس نے وہاں شادی رچالی اور وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ مکندے کی ایک بیٹی ڈیرہ اسمٰعیل خان اور دوسری لورالائی بیاہی گئی تھی۔ وہ خود اپنی بوڑھی بیوی اور چھوٹی بیٹی پریا کے ساتھ اس بڑی حویلی میں رہائش پذیر تھا۔ حق نواز چھ سات ماہ تو مکندے کا کام دل لگی سے کرتا رہا لیکن آہستہ آہستہ اس کی ہڈیوں میں رچی بسی سستی اور کاہلی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ وہ سارا دن بھنگ پی کر ٹوٹی چارپائی پر سوتا رہتا اور اس کا بیٹا صادق بیٹھک پر رکھے پانی کے مٹکے بھرتا۔ صادق کی عمر ۱۴، ۱۵ سال ہوگئی۔ مکندے نے اسے یوں بھاگ بھاگ کام کرتے دیکھا تو اپنا معتمد خاص بنالیا۔ وہ اسے زمینوں اور دیگر معاملات کے حل کے لیے جرگوں میں شریک کرنے لگا۔ یوں حقو کی جان چھوٹ گئی اور وہ صرف بھنگ کا ہو کر رہ گیا۔ مکندے کی عادت تھی کہ وہ عصر کے وقت گندم کے دانے مٹھی میں بھرتا اور قبرستان پہنچ جاتا۔ اسے آتا دیکھ کر چڑیاں اور مینائیں اسے یوں گھیر لیتیں جیسے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ سر پر پکھیوں کی چھاؤں کے لیے وہ شادی دادا کی گھنٹیاں بجاتا۔ محرم میں ہر سال قبر کی لیپائی تو اس نے اپنی ذمے لی ہوئی تھی۔ لیپائی کے بعد رنگ برنگی چادروں اور جھنڈوں سے مزار کو دلہن بنا دیتا۔ ہر سال جیٹھ کے مہینے میں گندم کا حلوہ نیاز کرتا۔ گزشتہ آٹھ سال سے صادق مکندے کے گھر کا فرد بنا ہوا تھا۔ ایک دن پریا اور صادق گھر سے بھاگ نکلے۔ ساری ہندو برادری مکندے کے پاس آئی اور کہا کہ ''صادق کے خلاف ایف آئی آر درج کراؤ۔ حق نواز کی پولیس سے پٹائی کراؤ تو وہ اپنے بیٹے کے بارے میں بتا دے گا۔ ہم علاقہ کے سردار ہیں، ایک نوکر ہماری بیٹی بھگا لے گیا ہے۔ ہماری ناک کٹ گئی۔ سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ مکندے کی بیٹی بھاگ گئی۔'' لیکن مکندے نے کسی کی نہ سنی۔ کئی ہندو اس سے ناطہ توڑ کر چلے گئے۔ حق نواز کو جب پتہ چلا کہ ہندو اسے گرفتار کرانے کی سوچ رہے ہیں تو اس نے رات کی تاریکی میں گھر والوں کو ساتھ لیا اور درابن کو خیر باد کہہ دیا۔ اس دکھ نے مکندے کی کمر توڑ دی۔ وہ کئی دن تک گھر سے باہر نہ جا سکا۔ اس کی بیٹھک کے ساتھی بھی آہستہ آہستہ اسے داغ مفارقت دے گئے۔ چڑیوں کے لیے پانی سے بھرے کٹورے سوکھ گئے۔ کھرلوں اور

www.facebook.com/groups/AAKUT/

کناریوں میں پھر کسی نے دانے نہ رکھے۔ چارپائی شکستہ ہوگئی۔ پانی کے مٹکے بے رنگ ہو گئے۔ مکندے نے شرمساری کی خبر اپنے بیٹے کو نہ دی۔ چند ماہ بعد اسے کسی طرح اطلاع ہوگئی۔ وہ کلکتہ سے درابن آیا۔ زمینوں کی ذمہ داری ڈھلو ہندو کو دی اور ماں باپ کو کلکتہ لے گیا۔ وہاں ایک سال بعد مکندے کی بیوی انتقال کر گئی۔ اس کی بینائی بھی کمزور ہوگئی۔ بیٹے نے نظر کی عینک دلا دی مگر وہ عصا کا سہارا ضرور لیتا۔ ایک دن نسوار لینے کے لیے گھر سے نکلا اور تین دن تک واپس نہ آیا۔ بیٹے نے چوتھے روز کئی مشکلوں سے اس کو تلاش کر لیا۔ مکندے نے وہ رات گھر میں جیسے تیسے گزاری۔ صبح ہوتے ہی بیٹے سے کہا کہ ''میرا اس شہر میں دانا پانی ختم ہو گیا ہے۔ میں درابن واپس جا رہا ہوں۔ اتنے بڑے شہر میں میرا گزارا ممکن نہیں۔ میں دیہاتی آدمی ہوں، شہر کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آئی۔ یہاں لوگ گم ہو جاتے ہیں، اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، کسی کو سیدھے راستے کا علم نہیں۔ اتنے بڑے شہر کا کیا فائدہ جہاں پڑوسی کو پڑوسی نہیں پہچانتا۔ بیٹا بڑے شہر بہت انجان ہوتے ہیں۔ درابن رات کی روشنی سے محروم ہے، مگر وہاں میں کبھی گھر کی راہ نہیں بھولا۔ یہاں تو دن کو گم ہو گیا تھا۔ مجھے درابن کی گاڑی میں بٹھا دو۔ مجھے یہاں گھر چھوڑنے کا روگ کھائے جا رہا ہے۔ مجھے گھر کی خاکی دیواروں اور خاکی گلیوں کی یاد نے رُلا دیا ہے۔ میں درابن کے آسمانی چھپر کے نیچے بیٹھنے کو بھی ترس گیا ہوں۔ مجھے میری چڑیاں یاد کرتی ہوں گی۔ ان کے پانی کے برتن خالی ہوں گے۔ میں ان کے لیے پانی بھروں گا۔ میں کھرلیں دانوں سے دوبارہ تازہ کر دوں گا۔'' بیٹے نے لاکھ سمجھایا مگر مکندے نے کوئی بات نہ مانی۔ مکندا درابن واپس آ گیا۔ اس نے پانی اور دانوں کے برتن دھوئے اور ان کو تازہ کیا۔ لیکن بیٹھک آباد نہ کی کیونکہ اسے بیٹی کے بھاگ جانے کا شرم ناک لمحہ یاد تھا۔ مکندے کی ڈیرے بیاہی بیٹی دماغ کے کینسر سے مر گئی اور باقی خاندان اس سے ناراض تھا۔ کلکتے سے واپسی پر اسے کوئی ملنے نہ آیا۔ مکندا سارا دن تنہا گھر میں گزارتا۔ اب اس نے ریاض کو نیا خادم رکھ لیا تھا۔ ریاض جوانی کے دن بتا چکا تھا۔ وہ اتنا کرتا کہ مسافروں کے لیے بیٹھک میں پانی کے دو مٹکے بھر دیتا، مکندے کے لیے کھانا اپنے گھر سے بنوا لاتا۔ مکندے کو پریا کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔ اس نے گھومنا پھرنا چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن عصا کے سہارے دھوپ میں گھر کی اندھیری کوٹھڑیوں میں پاگلوں کی طرح پھرتا رہتا۔ ۱۹۴۵ء میں کبھی نہ آنے والے گاندھی جی درابن آئے۔ شیر شاہ کے تھلے پر انھوں نے جلسہ کیا۔ وہاں سارے کانگریسی جمع تھے۔ مگر مکندا ان سے ملنے بھی نہ گیا۔ بچوں سے چڑیاں خریدنا اور انہیں آزاد کر دینا ہی اب اس کا کاروبار تھا۔ ایک دن ایک زخمی چڑیا اس کے پاس لائی گئی جو کسی شکاری کا نشانہ بن گئی تھی۔ مکندے نے روپیہ دیا اور بچے سے چڑیا لے لی۔ وہ چڑیا کچھ دن ناراض بچوں کی طرح ادھر ادھر چھپتی اور کتراتی رہی۔ مکندا کانپتے ہاتھوں سے اُسے پکڑ کر کھلاتا پلاتا، ریاض کو بھی تاکید کرتا کہ وہ زخمی چڑیا کا خیال رکھے کہ کوئی

www.facebook.com/groups/AAKUT/

بلی یا چیل اُسے کھا نہ جائے۔ کچھ دن بعد اس کا زخم تو مندمل ہو گیا مگر وہ پر ٹوٹنے کے باعث اڑ نہیں سکتی تھی۔ سارا دن پاؤں پاؤں چلتی، مکندے کی حویلی میں ناچتی پھرتی۔ مکندا اسے بڑے پیار اور رحم دلانا نظروں سے دیکھتا۔ چڑیوں کے غول پانی اور گندم کے دانوں سے بھرے برتنوں پر جمع ہو جاتے۔ چڑیاں اک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی دانہ چگتیں اور پانی پیتی رہتیں۔ زخمی چڑیا بھی ان کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ مکندا ریاض سے کہتا ''میں ان چڑیوں کے جھگڑے دیکھنے کے لیے کلکتہ سے واپس آ گیا ہوں۔ ہمارے قصبے کی چڑیوں کے ناز نخرے ہی جدا ہیں۔ کلکتہ کی چڑیاں ایسی نہیں۔ ہمارے علاقے کی چڑیاں بھی دیسی ہیں۔ یہ دیہاتی عورتوں کی طرح ہر وقت بولتی رہتی ہیں۔ جٹیاں (دیہات کی عورتیں) چاہے پانی بھریں چاہے گندم کی کٹائی یا سلائی کڑھائی ان کی زبانیں خاموش نہیں رہ سکتیں۔ اسی طرح چڑیاں بھی چپ نہیں رہتیں۔ ریاض یہ زخمی چڑیا تو ہمارے گھر رہتے رہتے جٹی بن گئی ہے۔ یہ پکی جٹی ہے۔ اس کی ساری عادتیں جٹیوں جیسی ہیں۔'' چڑیوں کا غول کھا پی کر دیوار پر جا ٹھہرا، جٹی چڑیا نے بھی بساط بھر کوشش کی کہ دوسری چڑیوں کے ساتھ اڑ کر دیوار پر پہنچ جائے مگر اڈاری بھرتے ہی دیوار سے ٹکرا کر گر گئی۔ دن کو جٹی چڑیا کے کئی دوست اور سہیلیاں ہوتیں لیکن کالی رات اسے اکیلے ہی کاٹنی پڑتی۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ وہ رات کسی گھڑے کے پاس بیٹھے بیٹھے گزار دیتی۔ اس کی شب اس طرح کٹتی جیسے کوئی راہ بھولا تنہا صحرا میں رات گزارے۔ مکندا صبح سویرے اشنان کرنے کے لیے جاگتا تو جٹی چڑیا چوں چوں کر کے بولنا شروع کر دیتی۔ مکندا بھی اپنی تنہائی چھپانے کے لیے اس سے باتیں کرنے لگتا۔ ''جٹی تم جاگ رہی ہو''، ''سو جاؤ ابھی تو رات ہے۔'' مکندا بولتا تو جٹی چڑیا کو اور جوش آ جاتا۔ وہ مزید زور زور سے بولنا شروع کر دیتی۔ ''تم پوری جٹی ہو۔ جٹیاں بھی صبح سویرے جاگ جاتی ہیں۔ جٹی تم سو جاؤ۔ جٹیوں نے گھر کے کام کاج کرنے ہوتے ہیں۔ تم نے کیا کرنا ہے کہ صبح دم جاگ گئی ہو۔'' وہ مکندے کی چارپائی کے اور قریب آ جاتی۔ ایک دن جٹی چڑیا دوسری چڑیوں کے ساتھ دانہ چگنے میں مصروف تھی کہ بلی نے اچانک حملہ کر دیا۔ باقی چڑیاں تو اڑ کر دیوار پر جا بیٹھیں مگر جٹی چڑیا زندگی کے تگ و دو کرنے کے باوجود بلی کے ہاتھ لگ گئی۔ مکندے نے اپنا عصا اور ریاض نے جو پانی پی رہا پانی کی ڈولی بلی کو دے مارے۔ ڈولی بلی کے سر میں جا لگی، وہ اپنی جان خطرے میں دیکھ جٹی چڑیا کو بھول گئی۔ مکندے نے جٹی کو اٹھایا جو ڈر کے مارے سہمی ہوئی تھی، اس کے جسم سے خون رس رہا تھا۔ مکندے نے جٹی کو پنجرے میں بند کر دیا، کئی دن اس کی مرہم پٹی کرتا رہا۔ مکندا رات کو جٹی چڑیا کا پنجرا تار سے باندھ دیتا اور دن کو زمین پر رکھ چھوڑتا۔ پھاگن کی ہوائیں جوبن پر تھیں۔ یہ چڑیوں کے لیے محبت کا موسم ہوتا ہے۔ ایک چڑا جٹی چڑیا کے آس پاس بہت گھومتا رہتا۔ جٹی بھی اپنی دم ہلاتی رہتی۔ مکندے نے ان کے دل کا راز جان لیا۔ وہ دن کو جٹی چڑیا کو پنجرے سے آزاد کر دیتا۔ دن

www.facebook.com/groups/AAKUT/

بھر دونوں کھیلتے کودتے رہتے۔ جب جٹی امید سے ہوگئی تو دونوں تنکے چننے لگے۔ وہ تین دن تو یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ گھونسلا کہاں بنائیں۔ چڑا تنکا اٹھائے چھپر کے شہتیر پر جا بیٹھتا اور جٹی تنکا چونچ میں تھامے اگلی میں جا ٹھہرتی۔ آخر چڑے نے اس کی بات مان لی۔ جٹی چڑیا نے اگلی میں انڈے دیئے۔ جٹی رات کو انڈوں پر بیٹھتی مگر چڑا شہتیر پر بیٹھا مشکل سے شب گزارتا۔ مدت پوری ہونے پر انڈوں سے بچے نکل آئے۔ چڑیا اور چڑے نے کیڑے مکوڑے اور دانے بچوں کے منہ میں ڈالنا شروع کر دیے۔ اس دوران مکندے کو بخار ہو گیا۔ وہ کئی دن بستر سے نہ اٹھ سکا۔ پڑوسیوں کے ایک بچے نے چھت پر چڑھ کر جٹی چڑیا کو نشانہ بنایا۔ بدقسمتی سے کنکر چڑے کو جا لگا اور وہ کانپتے کانپتے مر گیا۔ چڑے کی موت کے بعد جٹی نے ہمت نہ ہاری۔ وہ لنگڑاتی، گرتی پڑتی اکیلے ہی بچوں کے لیے دانے لاتی اور ان کی پرورش کرتی رہی۔ جانور اور پرندے بھی انسان کی طرح ہیں۔ یہ ذی روح زندگی کا بار اٹھائے دکھ درد برداشت کرتا بقا کی منزل کی سمت رواں دواں ہے۔ جب مکندے کا بخار ہلکا ہوا تو پہلے کی طرح جٹی چڑیا کا حال جاننے آیا تو دیکھا کہ جٹی چڑیا کے بچوں کو چیونٹیوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے بچوں کو ان سے آزاد کرایا۔ ایک بچہ تو سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا جب کہ دوسرے کی سانسیں ابھی بحال تھیں۔ ریاض اور مکندا اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ ایک دن مکندا اپنی پرانی صندوقچیوں اور الماریوں سے زمینوں کے کاغذات تلاش کر رہا تھا کہ پریا کی بچپن کی گڑیا اس کو نظر آ گئی۔ وہ اسے اٹھائے باہر آیا۔ اس کی مٹی جھاڑی اور ریاض کو دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''رضو! یہ دیکھ پریا کی گڑیا۔ اس کا کپڑا کتنا پرانا ہو چکا ہے۔ اپنے لیے کپڑے پسند کرنے کی خاطر وہ میرے ساتھ بازار گئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کے گویا ہوا۔ ''پریا خود تو چلی گئی مگر گڑیا چھوڑ گئی۔ رضو! بیٹیاں اور چڑیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ چڑیاں ہمارے گھروں کی چھتوں میں گھونسلے اور پر چھوڑ کر سرد ہواؤں کے ساتھ اڑ جاتی ہیں۔ بیٹیاں اپنے کھلونے اور گڑیا چھوڑ کر ماں باپ کا گھر اجاڑ جاتی ہیں۔'' مکندا دیر تک اس گڑیا کو چومتا اور آنسو بہاتا رہا۔ جٹی چڑیا کا بچہ اگرچہ اڑنے کے قابل نہیں ہوا تھا پھر بھی اپنی استعداد کے مطابق گھونسلے سے باہر نکل آتا۔ اسے ایک جگہ آرام نہ آتا۔ ہر وقت ادھر ادھر پھدکتا اور اڑنے کی کوشش کرتا رہتا۔ ایک دن چیل کو موقع مل گیا وہ اسے اٹھا لے گئی اور جٹی چڑیا روتی بلکتی رہ گئی۔ مکندے کو دوسری مرتبہ کے بخار نے اٹھنے کے لائق نہ چھوڑا اور وہ چارپائی کا ہو کر رہ گیا۔ مکندے کا آخری وقت جان کر ناراض برادری اسے دیکھنے چلی آئی۔ مشکل وقت میں ریاض نے اس کی بہت خدمت کی۔ ایک دن رضو نے یہ دیکھ کر کہ اب مکندا زندہ نہیں رہ سکے گا کہا ''سیٹھ جی! تیری بیماری کی اطلاع تیرے بیٹے کو بھجواؤں۔'' مکندے نے کہا ''نہیں''۔ رضو نے دوبارہ کہا کہ ''لورالائی تیری بیٹی کو خبر کروں'' مکندے نے جواب دیا ''نہیں'' ریاض کہنے لگا ''سیٹھ جی! کوئی دوسرا اپنا ہو تو!''

مکندے نے کہا ''رضو! اس کی ضرورت نہیں۔ مرنے کے بعد مجھے ہر حال میں جلا دیا جائے گا۔ میری جگہ جلنے کوئی اور نہیں آئے گا۔'' ''سیٹھ جی! اور تو کچھ نہیں۔ بس یہ ہوتا ہے کہ انسان آخری وقت میں اپنے پیاروں کو دیکھ لیتا ہے۔ اور وہ بھی تیری کھلی آنکھیں دیکھ لیتے۔'' مکندا سسکنے لگا اور کہا ''رضو یہ کھلی آنکھیں کسی کو دکھانے کے قابل نہیں۔ میں تو ان کو چھپاتے پھر رہا ہوں۔ بختوں جلی کسی کے سامنے جانے کے قابل نہیں۔ اس لیے تو میں ان کو کلکتہ لے گیا تھا۔ اسی لیے تو میں دو سال سے گھر میں قید ہوں۔'' ریاض نے تسلی دی ''سیٹھ جی! تقدیر کا لکھا کوئی نہیں ٹال سکتا۔ صبر کرنا پڑتا ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔'' مکندے نے ریاض کو کچھ کاغذات دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ بیٹھک اور باغ میں نے تیرے نام کر دیے ہیں۔ زمین پریا کی ہے۔ کئی دنوں سے برادری والے کہہ رہے ہیں کہ ہم دلی جا رہے ہیں تم بھی چلو کیونکہ یہ ملک اب تقسیم ہو رہا ہے۔ مسلمان یہاں آئیں گے اور ہندو وہاں جائیں گے۔ ریاض میں تو جنم بھومی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں کلکتے جا کر دیکھ چکا ہوں۔ گھر بار چھوڑنا کتنا مشکل ہے۔ ریاض! پاؤں میں میخیں گاڑنی پڑتی ہیں۔ درابن میری کمزوری ہے۔ میں یہاں پیدا ہوا۔ یہیں مروں گا۔ سارے ہندو یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں بھی مہمان ہوں۔ پھر ساری درابن مسلمانوں کی ہو جائے گی۔ پھر پریا بھی لوٹ آئے گی۔ یہ امانت اسے دے دینا۔ وہ شرمندہ بھی نہیں ہوگی۔ وہ سر اٹھا کے چلے گی کیونکہ اپنی برادری میں سے کوئی بھی اسے طعنہ دینے والا نہیں ہوگا۔ ریاض یہ کناریاں اور کھرل بھی پانی دانوں سے بھرے رکھنے ہیں۔ اگر کبھی شادی دادا کی قبر کے پاس سے گزرو تو وہاں گندم کے چند دانے ڈال دینا اور میری طرف سے مزار کی گھنٹیاں بھی بجا دینا۔ یہ کام ضرور کرنا اور میری جٹی چڑیا کا بھی خیال رکھنا۔ یہ غریب مسکین بھی میری طرح تنہائی اور دکھوں سے بھری زندگی گزار رہی ہے۔ یہ جٹی مجھے بہت عزیز ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مکندے نے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

مسرت کلانچوی (سرائیکی)

ترجمہ: زاہد حسن

سفر تھل ماروکا

وسائی نے اپنی آخری اور چوتھی بیٹی بھی خیر سے بیاہ دی تو اسے یوں لگا جیسے زندگی کا سارا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہو۔ اُسے سکھ کا سانس آیا۔ مہندی کی رات جب سبھی اپنے پرائے گھروں کو چل دیئے اور گھر کے لوگ سو گئے تب اس نے اپنی چاروں بیٹیوں کو اکٹھا بلا کر کہا۔

''اپنی شادی کے یہ تیس برس میں تمہارے فرض کے بوجھ تلے پھنسی رہی ہوں۔ راتیں میری پلکوں میں جاگتی رہی ہیں اور دن کی روشنی ناگ کی طرح میرے سکھ آرام کو ڈستی رہی ہے۔ میرا انگ انگ تھکاوٹ سے ٹوٹتا رہا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ ایک دن میں اڑنے والی بوٹی بن جاؤں گی جو ہوا کے ہلکوروں میں بے فکر ہو کر اُڑتی پھرتی ہے اور اُڑتی اُڑتی آسمان میں گم ہو جاتی ہے۔''

پروین، نورین، شاہین اور یاسمین سبھی نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا، ہر آنکھ میں یقین تھا، حیرانی اور ڈر تھا۔ اور پھر وسائی نے ایک اوپری نظر ان پر ڈالی اور بولی ''میں نے اور تمہارے باپ نے سوچا ہے کہ ہم اپنی بستی چلے جائیں''۔

''پر کس لیے اماں؟'' پروین نے اپنے ہاتھوں سے مہندی کھرچتے بے چینی سے پوچھا۔

''اب ہماری واپسی کا سفر شروع ہو گیا ہے بیٹا۔''

''پر اماں واپسی کے سفر کی تھکاوٹ؟'' یاسمین اپنے چھوٹے کا سر گھٹنے پر دھرتی بولی۔

''واپسی کے سفر کی کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی، بیٹا، سارے راستے دیکھے بھالے ہوتے ہیں، اپنے اپنے سے لگتے ہیں، ہم جہاں سے آئے ہیں، آخر وہیں پلٹ جانا ہوتا ہے ناں۔ مجھے تو کلانچوالے کی مٹی خوابوں میں بھی پکارتی ہے۔ راجباہ کے کنارے سے اتر واور بستی کی طرف چلو تو چھوٹے سے ٹبے پر پیلو کے درخت قبرستان پر چھاؤں کیے کھڑے ہیں۔ ان درختوں پر لگی سرخ، سبز پیلو، پیلی سرسوں، دارے کی حویلی والی بڑی سی بیری کا درخت اور بوا کے گھر کے ساتھ والے نیم کے پیڑ کی خوشبو مجھے بلا رہی ہے۔

لڑکیوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ بڑی بڑی باتیں کرتی سیدھی سادی ماں انہی کی ہے؟۔

''پر اماں! ہم تم سے دُور کیسے؟''

www.facebook.com/groups/AAKUT/

نورین تھوک نگلتے اور آنکھوں میں اترتے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''بڑھاپے میں مجھے سکون سے رہنے دو' لڑکیو' اپنے اپنے گھر بستی رہو۔ اپنے دکھ آپ سہو۔ اپنی فکروں سے لڑنے کے قابل بنا دیا ہے تمہیں میں نے۔''

''اماں تم تو بالکل ہم سے جان چھڑوا رہی ہو''۔ منجھلی شاہین غصے سے بولی۔

''تم میرے پاس کلانچوالے ضرور آتی رہنا۔ پر اکیلے روتے' پیٹتے نہیں بلکہ اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ہنستے کھیلتے۔ تم ایک دن مجھ پر رونے تو ضرور آؤ گی۔ بس اس وقت مجھے اپنے سارے دکھ سنا سنا کر رونا' میں بند آنکھوں اور بند ہونٹوں کے ساتھ تمہیں آخری دلاسا دے کر چل دوں گی۔''

''ہائے اوئے میری ماں۔'' بڑی یاسمین نے گھٹنوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا'' کیسی دل دہلانے والی باتیں کرتی ہو۔'' اور پھر سبھی لڑکیاں رونے لگیں۔

وسائی نے جو کہا' کر دکھایا۔ آخری مہمان بھی چلا گیا تو وہ اور امیر بخش اپنا تھوڑا بہت سامان اٹھا کر گاڑی میں آن بیٹھے۔ آج رستے کی دھول وسائی کو بادلوں کی کارستانی لگتی تھی جس میں وہ اڑنے والی بوٹی کی طرح اُڑتی پھرتی تھی۔ اس کا من چاہتا تھا کہ وہ دُور دُور تک پھیلے کھیتوں' پیلو کے درختوں سے بھرے ٹیلوں' بہتے راجباہ کے بھی پانیوں اور کھجوروں کو بچوں کی طرح اپنے بازوؤں میں بھر لے اور دل سے لگا کے کہے۔ ''میرے بچھڑے ہوؤ میں چلی آئی ہوں۔''

بوڑھی بوا نے ان کا کمرہ کھول دیا تھا۔ اس میں سے وسائی کو رویل اور مہندی کی وہی خوشبو آئی جس میں رچی بسی وہ پہلی بار اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اسے دیوار میں ٹھکی وہ کیل (کلی) بھی نظر آئی جہاں امیر بخش نے اپنا سہرا اتار کے دھرا تھا۔ وسائی نے مسکرا کر امیر بخش کو دیکھا اور امیر بخش نے اسے۔

وسائی نے کھڑکی کیا کھولی ساری بستی اڑ کے ان کے پاس آ گئی جیسے تالاب پر پیاسے پنچھیوں کا جھرمٹ اکٹھا ہو جاتا ہے۔ وہ بیٹھے ان کی باتوں کو گھونٹ گھونٹ پیتے تھے۔

بستی والے سارا دن کام میں جُتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ فارغ ہیں' ہر وقت فارغ' ان بچوں کی طرح جو سارا دن حویلی کے اندر چیختے' چلاتے' روتے' ہنستے اور کھیلتے کودتے رہتے ہیں۔

وسائی نے تو سوچا تھا وہ ہر وقت اپنے گھر پڑی سوئی رہے گی۔ تیس برس کی نیند پوری کرے گی لیکن اسے ذرا سی سستی آئی تو دوسرے ہی گھر سے بختو روتے پیٹتے آن پہنچی۔

''اڑی دیکھ چاچی رضو نے آج بھی میرے شوہر کو میرے خلاف اکسایا ہے۔ اس نے مجھ سے جھگڑا کیا ہے۔ وہ عورت میرا گھر برباد کر کے رہے گی۔'' کسی وقت مراد خاتون اپنے بچوں کا رونا رونے آ بیٹھتی اور کسی وقت سب اولاد بچل اس سے آ کر ٹوٹکے پوچھتی۔

وسائی اکتا گئی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ جس زندگی کے لیے اپنی بیٹیوں کو چھوڑ آئی تھی وہ اسے

www.facebook.com/groups/AAKUT/

بے اولاد بچل اس سے آ کر ٹوٹکے پوچھتی۔

وسائی اکتا گئی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ جس زندگی کے لیے اپنی بیٹیوں کو چھوڑ آئی تھی وہ اسے ہر قدم تڑپا رہی ہے۔ وہ اس سے کیسے جان چھڑائے۔

وسائی نے اب اندر سے در بند کر لیا۔ پچھلی کھڑکی کھول دی جہاں سے صرف قبرستان، سرسوں اور کنواں نظر آتا تھا۔ اس کی روح چاہتی تھی وہ ان بے جان اور بے زبان چیزوں کے ساتھ رشتہ گانٹھے لیکن اب بھی دروازے پر دستک ہوئی۔

ست بھرائی پیالہ لیے سالن لینے آئی ہوتی اور کسی وقت نورا موچی ادھار پیسے مانگنے آن کھڑا ہوتا۔

''زندگی میں سکون کیوں نہیں۔ آرام کس نکڑ میں چھپا ہے؟''

امیر بخش سارا دن بیٹھک میں بیٹھا کڑاک مار کے حقہ پیتا رہتا۔ رات گھر واپس آیا تو وسائی سر باندھے پڑی تھی۔ وہ بولا۔ ''میں تو سمجھتا تھا اب یہ سر تم نہ باندھو گی، یہاں بھی تمہارا وہ پرانا وطیرہ نہ گیا۔''

''امیر بخش زندگی ختم ہو چکی۔ کچھ دن سکھ سے گزارنے کی حسرت تھی لیکن لگتا ہے پوری نہ ہو گی۔''

''وسائی۔ بھرا صحن ہے، تو کس کس سے منہ موڑے گی؟''

''امیر بخش سکھ انہیں حاصل ہوتا ہے جن کے گھر اکیلے ہوتے ہیں۔ میری مانو تو گھر کے آگے دیوار کھڑی کر دو۔''

''وسائی پاگل نہ بنو۔ بستی میں مذاق بن جاؤ گی۔ لوگ کیا کہیں گے؟ تم کیا جواب دو گی؟''

لیکن جس وقت وسائی کا اپنی دیورانیوں سے جھگڑا شروع ہوا تو وسائی کو بٹوارے کے لیے بہانہ مل گیا۔ دو کمی بلائے اور کچی دیوار ڈلوا دی اور گلی میں کھلنے والا دروازہ بھی بند کروا دیا۔ پچھلی کھڑکی جس کا رخ بے جان کھیتوں اور قبرستان کی طرف تھا اس کو تڑوا کے دروازہ لگوا دیا اور سکھ کا سانس لیا۔ اُس نے سوچا شاید وہ دن آ گئے جس کا اُسے انتظار تھا۔

لیکن آج صبح وہ مٹی گوندھ کر سوئی تو اس کے سر میں چیونٹیاں چلنے لگیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنے لگا۔ اس نے پھر سر باندھا اور دوا کا پھکا مارا اور تخت پر دراز ہو گئی۔ لیکن درد سر سے بڑھتے بڑھتے پورے جسم میں بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بدن یوں ٹوٹنے لگا جیسے مٹی کا کھلونا تڑکنے لگتا ہے۔ وہ کمر پر ہاتھ دھرے دھرے روتی کراہتی اٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ واپس تخت پر آن سوئی تو اسے لگا ٹھنڈی ہوا اسے بلا رہی ہے۔ سرسوں کی سینک اس کے وجود میں سوئیوں کی مانند چبھ رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ اٹھے اور اٹھ کے پانی کا گھڑا الٹا دے اور جی بھر کے پانی پیے، لیکن اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔ وہ دروازے سے باہر دیکھنے لگی۔

آج باہر بادل تھے، فضا ہلکی گہری تھی۔ ہوا درختوں میں سیٹیاں مارتی پھرتی تھی۔ ایک سوکھے تنے پر چیل سر نیہوڑائے بیٹھی تھی، سرسوں کا پیلا رنگ بھی پھیکا پھیکا تھا۔ نہر کا پانی سوکھا پڑا تھا۔ اس دو جے نظارے میں

www.facebook.com/groups/AAKUT/

وسائی نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی لیکن لگتا یوں تھا ہمسایوں' اپنوں کی طرح اس کی نیند بھی روٹھ گئی ہے۔ اسے امیر بخش پر بہت غصہ آیا۔ "مرد ذات کا کیا اعتبار' کس وقت چھوڑ دے' ڈبو دے' بیٹھا ہوگا جوانوں کی گپیں سنتا۔

"آ' میں تجھے قصہ سناؤں" ہوا نے اس کے بالوں میں انگلی پھیرتے سرگوشی کی۔ "پر کیا سناؤں؟ تمہارا تو اپنا قصہ تمام ہو رہا ہے۔ حیاتی کے آخری لمحوں میں تمہارے پاس سکون ہے۔ آرام ہے خاموشی ہے۔"

"سکون آرام' خاموشی' وسائی کے ہونٹوں پر سسکی ابھری۔ لیکن محسوس ہوا اس سسکی کو اس نے زور سے اپنے ہونٹوں سے کھینچا۔ دل میں خوشی کی کوئی کرن نہ تھی۔ قبرستان کے پیلو کے درختوں کی اداسی آہستہ آہستہ چلتے اس کے سرہانے آن کھڑی تھی۔ شاید اسے لینے آئی تھی۔ اس کا دل ڈولنے لگا۔ اس خوف سے کہ پلکیں بند نہ ہو جائیں' اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کا دل چاہا کوئی تو اس کے پاس آئے' اسے اپنی ساس سے ہونے والا جھگڑا سنائے۔ کوئی آئے بھینس کا دودھ سوکھ جانے کا رونا روئے' کوئی تو آ کر بتائے کیسے اس کے بچوں نے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کوئی سالن لینے ہی چلا آئے لیکن خالی ہوا سیٹیاں مارتی رہی اور کتا بھونکتا رہا۔

قاضیوں کا چھوٹا، جو مرغ کو پکڑتا پھرتا تھا، وہاں سے گزرا تو وسائی نے کانپتے لہجے میں اسے پکارا لیکن بچہ اسے دیکھ کر بھاگ گیا۔ وسائی نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن یہاں خوف تنا کھڑا تھا۔ وسائی نے اپنے چہرے پر چادر لے لی۔ اسے محسوس ہوا' کوئی سایہ قبرستان سے نکل کر تیز تیز چلتا اس کی طرف آ رہا ہے۔

وسائی کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا ابھی ٹھہر جائے گا۔ پھر وہ سایہ بالکل سر پر آن کھڑا ہوا۔ اس پر جھکا۔ وسائی نے چیخنے کی کوشش کی لیکن آواز گلے میں پھنس کے رہ گئی۔

"وسائی' وسائی کیا ہوا ہے تجھے؟" امیر بخش نے اس کے چہرے پر سے چادر ہٹا دی اور اس کے ماتھے پر بہتے پسینے اور آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ "قاضیوں کے چھوٹے نے بتایا کہ نانی رو رہی ہے اور میں دوڑا آیا۔"

"امیر بخش ابھی یہ دیوار گیلی ہے کچی ہے اسے پھینک دو"۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو وسائی؟"

"ہاں میری لڑکیوں کو بھی بلوا۔ شاہین کا چھوٹا بیمار ہے۔ نورین خاوند سے روٹھی ہوئی ہے۔ یاسمین بے چاری تو بھوکے گھر میں بیاہی ہے' جانے کیسے گزارا کر رہی ہوگی اور نئی بیاہی پروین جانے خوش بھی ہے یا نہیں۔"

"کیا ہو گیا ہے تجھے' پھر فکریں گلے لگانے لگی ہے۔"

"ہاں! امیر بخش یہ فکر' اندیشے' حیاتی کا رنگ ہیں اور خاموشی سکون اور بے فکری موت کا بھدا روپ۔ میں ابھی جینا چاہتی ہوں۔ امیر بخش مجھے جینے دو۔"

www.facebook.com/groups/AAKUT/

مسرت کلانچوی
(سرائیکی سے ترجمہ) سلیم سہیل

پانی نہیں پیوں گی

''سائلنس۔کیمرہ آن۔سٹارٹ''

''میں پانی نہیں پیوں گی۔اس میں کیڑے ہیں۔''

ماڈل گرل روبی نے بوتل کو غور سے دیکھا۔اُٹھی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔سٹوڈیو سے باہر آتے ہوئے لمبا سانس لیا۔اور تازہ ہوا کو گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

ستیاناس، ریکارڈنگ کیسے ہوگی؟ اس کی ان غلط حرکتوں کے باعث اسے اشتہار میں سے نکالنا پڑے گا۔

ڈائریکٹر غصے سے چنگاڑا۔

وہ تیز تیز گاڑی چلاتی ہوئی گھر آ گئی۔خالہ، پانی لانا۔وہ صوفے پر گر پڑی۔نوکرانی کرسٹل کے لشکتے ہوئے گلاس میں پانی نکال لائی اور اس میں پانی ڈال کر اُسے دیا۔

''خالہ اس میں کیڑے تو نہیں؟ اس نے گلاس میں جھانکتے ہوئے کہا۔''

''ہائے ہائے بیٹا'' میں تو پہلے ہی کہتی تھی اشتہار بنانے کے لیے روہی نہ جاؤ۔کئی بلائیں تیرے جیسی سوہنی صورتوں پر عاشق ہو جاتی ہیں۔

''عاشق وہ نہیں، عاشق تو میں ہوگئی ہوں خالہ، روبی نے خالہ کو سُرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا''

خالہ کے ہونٹ چلنے لگے وہ آیت الکرسی پڑھ رہی تھی۔روبی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئی۔

''فضا میں وسعت کیوں نہیں؟''

''آسمان کا رنگ نیلا کیوں نہیں؟''

تارے کتنے پھیکے پھیکے ہیں۔چاند پیلا اور بیمار ہے۔رات کو سفر کرنے والا پرندہ کہاں چلا گیا۔ہوا میں سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔میں کہاں ہوں۔کہاں آ گئی ہوں۔میں وہاں کیوں نہیں جہاں میری روح بچھڑ گئی تھی۔میری روح کہاں ہے۔صدیاں ماضی کا سفر طے کر چکی ہیں۔جب میں رات کو چُھپ چُھپ کر باہر صحرا میں نکل آئی ہوں تو میلوں پرے تک بکھری ریت اور چاند کی کرنیں محو رقص تھیں اور اکیلا پرندہ ٹیلوں پر سفر کر رہا تھا۔تب میں اپنے بدن کو اپنی روح سے جُدا کر رہی تھی اور اُس پرندے کو اپنا ہم سفر دیکھتی تھی۔وہ پرندہ مجھے انجان راستوں سے یہاں لایا تھا۔جہاں ٹیلوں کے بیچ ایک پرانی جھونپڑی میں چھوٹا سا خاندان آباد تھا۔ماں چرخا کاتتی تھی۔کھیس بنتی تھی۔بہو

www.facebook.com/groups/AAKUT/

لسّی بلوتی تھی اور کھیس سیتی تھی۔ بچہ لیلے سے کھیلتا تھا اور باپ اونٹ چراتا تھا۔ اُن کے چہروں پر اطمینان تھا۔ روبی کو یوں لگا کہ یہ اُس کے آباؤ اجداد ہیں۔ جھونپڑی، مٹی کے برتن، پیالے اُن کا ورثہ ہیں۔ یہ وہ کائنات ہے جو وہ گنوا بیٹھی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جو پتا نہیں کہاں کھو گئی ہے۔ رات گئے تک وہ انہی آسیبوں کی پکڑ میں رہی۔ وہ۔۔۔ وہ چاندنی میں تیرتی رہی کئی زمانوں کا سفر طے کرتی رہی، دن ہوا تو وہ اپنی ٹیم کے ہمراہ سفر کر رہی تھی، ڈائریکٹر نے ایک تالاب کے قریب جیپ کھڑی کر دی۔ نہ جانے کتنی پرانی بارشوں کا بھرا ہوا تالاب تھا۔ سُرخ پیلی گھاگھروں والی عورتیں اُس میں سے پانی بھر رہی تھیں۔ ڈائریکٹر یہاں فلم بنانے لگا اور روبی اُس تالاب کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ غور سے پانی میں دیکھا تو اُس میں مینڈک تیرتے ہوئے نظر آئے۔

''آپ اس پانی کا کیا کریں گی؟ اُس نے ایک عورت سے پوچھا؟''

''پیوں گی۔''

''لیکن اس میں تو مینڈک ہیں۔''

''اس میں تو دوسرے کیڑے بھی ہیں۔''

''آپ واقعتاً یہ پانی پئیں گی؟''

''تو اور کیا، پیاس سے مروں گی؟''

روبی کو لگا کہ اُس کی روح جو ٹھنڈی یخ رات کی تازہ ہوا اور ٹھنڈی چاندنی میں بھٹکتی رہی ہے ایک بار پھر اس وجود سے نکل کر اُس تالاب میں جا پڑی ہے۔ کیڑے اس کے وجود سے لپٹ گئے ہیں۔ وہ گندے پانی میں اندر ہی اندر غوطے کھا رہی ہے۔

روبی بھاگ کر گاڑی میں آ گئی۔ باقی ٹیم بھی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سب لوگ بوتلوں میں سے صاف ستھرا منرل واٹر نکال کر پی رہے تھے اور روبی سوکھے ہونٹوں پر بان پھیر رہی تھی۔

''پانی پیو۔ ڈائریکٹر بولا۔''

''اب کبھی پانی نہ پیوں گی۔''

وہ آنکھوں میں آئے آنسو پینے لگی اور پھر ایک دن ریس کورس پارک کے آسمانوں کو چھوتے رنگین فواروں کے سامنے روبی جوگنگ کر رہی تھی۔ وہ اپنے جسم، اپنے دل، اپنی روح اور اپنی سوچ کا بوجھ کم کرنا چاہتی تھی۔ چونکہ وہ اب اک فلاپ ماڈل سمجھی جاتی تھی۔

☆☆☆☆

www.facebook.com/groups/AAKUT/